دو سفر

سفر دو ہیں۔ ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا۔ اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وُہ اپنا کام کیے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لیے قربان کر دیں —— جب انہوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا اُن کا سفر منزلِ مقصود تک پہنچ گیا اور وُہ کامیاب ہو گئے۔ اب اُن کے لیے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہُوا یا نہیں۔ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصد ہے اور اس بے صبر مسافر نے اس مقصد کو پا لیا اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔

یہاں راہ اور منزل دو نہیں، ایک ہی ہیں ؎

راہرواں را خستگی راہ نیست

عشق ہم راست ہم خود منزل است

باقی رہا مقصد کا سفر! تو اس کی کامیابی بلاشبہ یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو بیج بوتا ہے بلکہ یہ خدا کا کام ہے —— جو سورج چمکاتا ہے اور بدلیاں بھیجتا ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے اگر راہروانِ مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔

امام الاحرار السیّد محی الدین احمد

احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

محمد سعید الرحمٰن علوی

عَنْ عَائِشَۃَ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ وسلم حَسْبُکَ مِنْ صَفِیَّۃَ کَذَا وَکَذَا قَالَ بَعْضُ الرُّوَاۃِ تَعْنِیْ قَصِیْرَۃً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ کَلِمَۃً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْہُ قَالَتْ وَحَکَیْتُ لَہٗ اِنْسَانًا قَالَ وَمَا اُحِبُّ اَنِّیْ حَکَیْتُ اِنْسَانًا وَاِنَّ لِیْ کَذَا وَکَذَا (ابوداؤد۔ترمذی)

غیبت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ وہ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کو حضرت صفیہ (آپ بھی حضور علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ تھیں) رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق یہ چیزیں کافی ہیں۔ (بعض راویان حدیث نے بیان کیا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا چھوٹے قد کی تھیں) یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و اصحابہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم نے ایک ایسا کلمہ کہا ہے کہ اگر اس کو سمندر میں ملا دیا جائے تو اس پر غالب آجائے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا میں نے (تو) ایک آدمی کی حالت کا تذکرہ کیا آپ نے فرمایا میں اپنے سے کسی کی نقل کو پسند نہیں کرتا اگرچہ میرے لیے اتنا اتنا (مال) ہو

حضور علیہ السلام کی ازواج مطہرات میں حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی شامل تھیں جو علاقہ خیبر کے ایک بہت بڑے سردار کی صاحبزادی تھیں۔ فتح خیبر کے بعد مسلمان ہو کر آپ کے عقد میں آئیں۔ امت کے عام افراد کے لیے ضرورۃً چار بیویوں کی اجازت ہے لیکن اللہ کے پیغمبرؐ کا معاملہ سوا تھا آپؐ نے کئی نکاح کیے جن کی مصالح پر الگ سے گفتگو کی جا سکتی ہے اور علماء نے بہت کچھ لکھا بھی ہے۔

اس حدیث میں کہنا یہ مقصود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ذکر میں صرف اتنی سی بات کہی کہ وہ چھوٹے قد کی تھیں تو حضور علیہ السلام نے اس کو بھی سخت ناپسند فرمایا۔ اور فرمایا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جسے سمندر میں ملا دیا جائے تو اس پر غالب آجائے۔ گویا غیبت اتنا بڑا گناہ ہے کہ اتنی سی بات سمندر کو متاثر کر سکتی ہے۔

قرآن عزیز کی سورۃ حجرات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے غیبت کے متعلق ارشاد فرمایا کہ غیبت کرنا ایسا ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔

غیبت کا معنی ہے کسی کی عدم موجودگی میں اس کا

(باقی ۶ پر)

جلد ۲۵ ✿ شمارہ ۴۸
۱۵ رجب المرجب ۱۴۰۰ھ ✿ ۳۰ مئی ۱۹۸۰ء

اس شمارہ میں

رئیس الادارہ
پیر طریقت حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ
مدیر منتظم : میاں محمد اجمل قادری
مدیر : محمد سعید الرحمٰن علوی

حضرات علماء کرام سے!

درسِ قرآن کا سلسلہ عام کریں

حضرت شیخنا العالم السید محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کی مالٹا سے واپسی کی گفتگو بہت معروف ہے جس میں آپ نے مسلمان قوم کی زبوں حالی کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے دو بنیادی اسباب ذکر فرماتے تھے یعنی قرآن کریم سے دوری اور باہمی اختلاف و انتشار۔ چنانچہ آپ نے اپنے خدام کو اس طرف توجہ دلائی اور قرآنی تعلیمات عام کرنے کی طرف بطور خاص متوجہ کیا۔

مالٹا سے قبل دہلی میں "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کا قیام جس کے نگران و انچارج حضرت الامام مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ تھے اور ان کے سفر کابل کے بعد حضرت الامام مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات قرآن کی روشنی سے منوّر ہو سکیں۔

اور حضرت لاہوری قدس سرہ کی سیرت کا وہ واقعہ تو سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ جیل تک میں آپ نے درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا اور ایسے وقت میں جبکہ آپ قید تنہائی کا شکار تھے اور کوئی مسلمان اڑوس پڑوس میں نہ تھا بنگالی ہندو کو لجاجت کے ذریعہ آمادہ کیا تاکہ وہ درسِ قرآن سن لیا کرے وہ آمادہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کا سامان کر دیا۔

یہ تمام حقائق اس لیے گوش گزار کئے گئے کہ ہم آئینہ ایام میں اپنا چہرہ دیکھ سکیں۔

قرآن عزیز جیسی کتاب ہے اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ ربّ کائنات کی نازل کردہ یہی کتاب ہے جسے اس کے نازل

کرنے والے نے ہدایت' فرقان' نور جیسے ناموں سے یاد فرمایا۔ اور حضور نبی مکرم خاتم المعصومین صلی اللہ تعالیٰ و آلہ و اصحابہ وسلم نے قوموں کے عروج وزوال کا انحصار اسی پر بتایا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں اس کتاب کو ہمیشہ بنیادی اہمیت حاصل رہی اور یہ کوشش رہی کہ شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد بچہ جس کتاب سے روشناس ہو وہ یہی کتاب ہو۔

لیکن امت کے زوال کے دور میں اس کا تعلیمی نظام بری طرح متاثر ہوا اور یہ کتاب اغیار کی ناوک افگنی کا اس لیے سب سے زیادہ شکار ہوئی کہ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ اس کی موجودگی میں ہماری دال گل نہیں سکتی۔ برطانوی وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں کتاب مقدس کی اسی وجہ سے توہین کی (العیاذ باللہ) جس کا برا انجام برطانوی حکومت کو جلد ہی دیکھنا پڑا۔ لیکن آج المیہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام میں اس کتاب کا کوئی حصہ نہیں اور جو ادارے اسی کتاب کی تعلیم کے لیے معرض وجود میں آئے تھے ان تک میں اس کتاب کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں اور ایسے علوم و فنون زیادہ توجہات کے مستحق قرار پائے ہیں جن کی دورِ حاضر میں ضرورت کے سوال پر بہرحال گفتگو ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد مساجد کا مسئلہ ہے تو وہ بہرحال "اللہ کا گھر ہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ آج مساجد میں بڑی ہی مجالس و محافل ہوتی ہیں جن کو مختلف عنوانات دیے جاتے ہیں اور نہیں توجہ تو اسی مظلوم کتاب پر!

اکثر مساجد ایسی ہیں جن میں بنیادی مکاتب تک کا انتظام نہیں اور اگر ہے تو وہ جس توجہ کے مستحق ہیں وہ توجہ نہیں اور درس قرآن کا وہ سادہ اور سلیس انداز جس کی برکات کا ایک زمانہ معترف ہے (ایک حضرت لاہوری قدس سرہ کے باقاعدہ درس سے لاہور کی کایا پلٹ گئی) اس کا چند جگہوں کے علاوہ کہیں بھی انتظام نہیں۔ اور جہاں انتظام ہے وہاں قرآن کے عنوان اور نام پر ملت کے انتشار اور تفریق کی گفتگو زیادہ ہوتی ہے قرآن کی کم۔

اس صورت حال کے جو نتائج ہیں ان سے صرف نظر کرنا دانش مندی نہیں حماقت ہے۔ اور ان سطور کے راقم کو سب سے بڑا گلا ان لوگوں سے ہے جو ان اکابر و اسلاف کے نام لیوا ہیں جن کا ذکر خیر اوپر کی سطور میں کیا گیا۔

لاہور ہی نہیں بلکہ پورا ملک ہماری نگاہوں میں ہے اور ہم یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہیں کہ ہمارے عزیز دوست جو دینی خدمات پر مامور ہیں وہ درس قرآن و حدیث کا ذرہ برابر لحاظ و پاس نہیں کرتے۔

ہم پوری دلسوزی کے ساتھ اکابر علماء سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے اپنے شہروں اور قصبات و دیہات میں اس طرف پیش قدمی فرمائیں۔ صبح و شام کے چند چند منٹ اس کارِ خیر کے لیے وقف کریں اور اسلاف امت کے انداز کے مطابق سادہ اور دلنشیں انداز میں قرآنی تعلیمات امت تک پہنچائیں' اس کے ساتھ ہی اپنے زیر اثر نوجوان علماء کی اس ضمن میں تربیت اور انہیں اس طرف توجہ دلائیں اور ان کی نگرانی کریں تاکہ ہر مسجد قرآنی درس کا گہوارہ بن جائے۔ اس کے بعد اپنے اپنے علاقہ کے عصری تعلیمی اداروں کے ذمہ دار حضرات سے مل کر تعلیم گاہوں اور ہاسٹلوں میں ایسے دروس کا اہتمام کرائیں جن سے ہمارے

عزیز نوجوان جو ملت کی قیمتی متاع ہیں وہ اس نور سے بہرہ ور ہو سکیں اور محلہ و گلی کی خواتین کے لیے باپردہ درس قرآن کی نشست کا اہتمام کریں تاکہ انسانی زندگی کا یہ دوسرا پہیا جو نئی نسل کی بنیادی تربیت کا ذمہ دار ہے کتاب ہدیٰ کی روشنی میں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو سکے۔ درس قرآن کا یہ سلسلہ مسلسل اور متواتر ہونا چاہیے۔

"قرآنی منتخبات کے درس" دورِ حاضر کی وہ بدعت ہے جس میں اہل درس کی دکانِ سیاست تو چمک سکتی ہے لیکن قرآن کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ درس میں واقعات کی ترجمانی ایسی دلنشیں ہونی چاہیے کہ "دامن دل می کشد" والی کیفیت پیدا ہو جائے اور انسانی طبائع دل کی گہرائیوں کے ساتھ اِدھر متوجہ ہو جائیں۔ سلسلہ درس میں لفاظی، اسرائیلی روایات اور اس نوع کی چیزوں سے احتراز برتا جائے اور منطق و فلسفہ کی نکتہ آفرینیوں اور موشگافیوں میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔

قرآن عزیز کے معلم اول صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم کے وہ جامع کلمات جو قرآنی تعلیمات کی تشریحات ہیں دارد ہیں وہ حرزِ جاں ہوں اور معلم اول کے فیض یافتہ حضرات کی ترجمانی پر انحصار کیا جائے کہ ان کا فرمایا ہوا معلم اول ہی کا فرمایا ہوا ہے۔

ہمارے قریبی دور کے اسلاف کی قبروں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے منور فرمائے انہوں نے سادہ زبان و بیان کے ذریعہ قرآن کی جو خدمت کی وہ ہمارے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے — آج کے خوشہ چینانِ علم کے لیے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت لاہوریؒ، مولانا عثمانیؒ، مولانا فتح محمد جالندھریؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع اور استاذ حدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطینِ ملت کے تراجم و تفاسیر کافی شافی ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اسی سرمایہ قرآنی سے اکتساب کر کے اس سے ملت کو روشناس کر کے ہم ملت کا رُخ موڑ سکتے ہیں۔

ہمیں یہ بات کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ نظام تعلیم کی اصلاح کی دور دور کوئی شکل نظر نہیں آتی لیکن اس کا انتظار چہ معنی دارد؟

آئیں اپنے مالک کی نازل کردہ کتاب کی روشنی گھر گھر پھیلانے کے لیے اسی کے سہارے اٹھ کھڑے ہوں۔ بدر و حنین میں فرشتوں کے ذریعہ امداد کرنے والی وہ ذات تمہارے عزائم میں برکت پیدا فرمائے گی اور اس راہ میں تمہارا اٹھایا ہوا ہر قدم فوز و فلاح کا ذریعہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو اور ہمیں حسن عمل کی دولت سے نوازے۔

علی

بچیوں کی تعلیم

اسلام خواتین کی تعلیم کا مخالف نہیں بڑا حامی ہے اور اسلام کی تاریخ اس احمقانہ اعتراض کا عملی جواب ہے کہ اس نے صنفِ نازک کو ہمیشہ اور ہر معاملہ میں اہمیت بخشی۔

لیکن جب عورت کو "خاتونِ خانہ" کے بجائے زینتِ محفل بنایا جانے لگے تو اسلام اس آوارگی پر سختی سے قدغن لگاتا ہے اور ایسے اعمال کے ذمہ دار لوگوں کو بدترین قومی مجرم قرار دیتا ہے۔

آج قومی مجرموں کی کمی نہیں جو تعلیم و صحافت اور خدا معلوم کس کس عنوان

سے صنفِ نازک کی عفت و حیا برباد کر رہے ہیں لیکن اس اندھیر نگری میں اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جو حقیقت کو سمجھتے اور اس راہ میں سرگرم عمل رہتے ہیں حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے لاہور میں بچیوں کی مثالی درسگاہ کا اہتمام فرمایا۔ اور اللہ کے فضل سے وہ درسگاہ اب بھی موجود ہے اور اپنا قومی فرض سرانجام دے رہی ہے۔ اس کے بعد گذشتہ سال حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفہ ارشد مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ لاہور کی عظیم الشان دینی درسگاہ "جامعہ اشرفیہ" کے ارباب حل و عقد نے ماڈل ٹاؤن لاہور میں بچیوں کی درسگاہ کا انتظام کیا ہے جس کے نتائج بڑے ہی حوصلہ افزا ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ یہ سلسلہ اس ستم رسیدہ طبقہ کی صحیح تعلیم و تربیت کا نہ صرف ضامن و کفیل ہوگا بلکہ آئندہ چل کر ایسا مینارۂ نور بنے گا جس کی روشنی چاروں طرف پھیلے گی۔

ان دونوں اداروں کی تعمیر و ترقی کے لیے دعا کے ساتھ ہم اہل وطن سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں ایسے مکاتب قائم کریں اور ان کی بھرپور سرپرستی فرمائیں کیا عجب کہ اس چنگاری سے کوئی شعلہ بھڑک کر ملت کی خوابیدہ قسمت کی بیداری کا ذریعہ بن جائے۔

بقیہ : احادیث الرسولؐ

اس انداز سے ذکر کرنا کہ اسے ناگوار ہو حضور علیہ السلام سے جب سوال کیا گیا کہ ہم کسی کی عدم موجودگی میں ایسی بات کریں جو اس میں واقعۃً موجود ہو تو کیا وہ بھی غیبت میں شامل ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہی تو غیبت ہے اگر ایسی بات کہی جائے گی جو اس میں موجود نہ ہو تو وہ بہتان ہے جو زیادہ سنگین جرم ہے۔

غیبت جیسا کچھ سنگین معاشرتی جرم ہے اس کا اندازہ مندرجہ بالا اشارات سے ہو سکتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں آج کے مسلم معاشرہ کی جو حالت ہے۔ وہ اتنی سنگین اور پریشان کن ہے کہ توبہ بھلی۔ عوام سے لے کر اہل علم تک کسی کی مجلس میں بھی آپ چلے جائیں سوائے غیبت و بدگمانی اور چغل خوری کوئی بات نظر نہیں آئے گی۔ بعض جائز صورتیں ایسی ہیں جن کا ذکر احادیث میں آتا ہے اور قرآن مجید میں بھی بعض اشارات موجود ہیں۔ مثلاً چھٹے پارہ کی ابتداء میں ہے کہ ظالم کے ظلم کا اظہار جائز ہے تاکہ دوسرے اس سے بچ سکیں اور مظلوم کی داد رسی کا انتظام ہو سکے۔ اس قسم کی چند واضح اور جائز صورتوں کے علاوہ جس نوع کے تذکرے اور چرچے ہمارے یہاں ہوتے ہیں وہ بڑے ہی شرمناک ہیں۔

غیبت، بدگمانی، ایک دوسرے کا مذاق اڑانا، ہنسی ٹھٹھا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے روکا اور سورۂ حجرات انہی معاشرتی آداب کے متعلق بھری پڑی ہے۔

مجالس میں اگر دوسروں کا ذکر کرنا ہی ناگزیر ہو تو باہمی محبت و احترام کے ساتھ ہونا چاہیے کہ اس سے دلوں میں عقیدت و احترام اور محبت بڑھتی ہے۔ اور معاشرہ صحیح معنوں میں جنتی معاشرہ بن جاتا ہے۔

مجلسِ ذکر

ضبط و ترتیب : علوی

دعوتِ دین بنیادی ذمہ داری

شیخ طریقت حضرت مولانا عبیداللہ انور دامت برکاتہم

محترم حضرات! حضور نبیؐ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و اصحابہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تین مساجد ایسی ہیں جن کی زیارت کی غرض سے سفر کی اجازت ہے بلکہ اللہ توفیق دے اور حالات سازگار ہوں تو ایسا کرنا چاہیئے۔ ایک تو مسجد حرام، دوسرے مسجد نبویؐ تیسرے بیت المقدس۔

مسجد حرام مکہ معظمہ کی وہ عظیم البرکت مسجد ہے جس کی تعمیر و بناء کا قصہ قرآن مجید میں موجود ہے جسے اللہ کے معصوم پیغمبروں کے مقدس ہاتھوں نے تعمیر کیا اور جو کائنات کے اہل ایمان و صلاح کی عقیدتوں کا مرکز ہے۔ اس مسجد مبارکہ میں ایک نماز کا ثواب لاکھ نماز تک ملنا احادیث میں موجود ہے۔ کسی کے خلوص و للّٰہیت کی بناء پر ارحم الراحمین اپنے فضل خصوصی سے اضافہ فرما دیں تو وہ مالک ہیں اور سب کچھ کہنے پر قادر۔

مسجد نبوی وہ مسجد ہے جو حضور نبی کریم علیہ السلام نے ہجرت کے انقلاب آفریں واقعہ کے بعد مدینہ طیبہ میں تعمیر کی۔ یہ جگہ یتیم بچوں کی تھی وہ مفت میں آپؐ کو دینا چاہتے تھے لیکن آپ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قیمت ادا کی اور پھر مسجد تعمیر ہوئی۔ امام الانبیاء خاتم المعصومین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم اور آپ کے عزیز رفقاء نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے تعمیر فرمایا۔ اس مسجد کے متعلق احادیث موجود ہیں کہ ایک نماز پر ۵۰ ہزار نمازوں کا ثواب نصیب ہوتا ہے۔ یہی وہ ہے جس کا ایک ٹکڑا روضۃ من ریاض الجنۃ کے نام سے موسوم ہے یعنی جنت کا ٹکڑا۔ حدیث میں ہے کہ میری آخری آرام گاہ اور میرے منبر کے درمیان کا حصہ روضۃ من ریاض الجنۃ ہے۔

تیسری مسجد، مسجد اقصیٰ ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرائی۔ سینکڑوں انبیاء علیہم السلام کی آخری آرام گاہیں اس خطہ مبارکہ میں موجود ہیں حضور علیہ السلام کے سفر معراج کی پہلی منزل یہی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ کہ ہم نے اس کے ماحول کو مادی و روحانی ہر اعتبار سے بابرکت بنا دیا ہے۔

(افسوس کہ ایک عرصہ سے یہ مبارک مقام پنجۂ یہود میں ہے اور جہاد اسلامی کے جذبہ سے عاری مسلمانوں کی بھیڑ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشہ دیکھ رہی ہے)

اس مسجد کے متعلق ایک نماز پر ۲۵ ہزار نمازوں کے

ثواب کی تصریحات موجود ہیں۔

ان تین مبارک مقامات کے علاوہ کسی چوتھی چیز کے قصد و ارادہ سے سفر کرنے کی اجازت نہیں۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام نے کوہ طور کے سفر کی بالقصد اجازت نہیں فرمائی۔

انسان کی زندگی کے مقاصد بڑے واضح ہیں۔ ان مقاصد سے انحراف کر کے سفر واسفار کا کوئی مقصد نہیں — حضرات اولیاء کرام اور صلحاء امت جن کی محبت و عشق میں آج گروہ در گروہ طول طویل سفر ہوتے ہیں ان کی اپنی زندگیاں اور ان کے علوم و معارف اس سستی محبت کی نفی کرتے ہیں اور اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ راہِ عشق کے مسافروں کے لیے قرآن و سنت کے پیغام رشد و ہدایت کو اپنی زندگی کا اصل محور بنانا چاہیے۔

ہمارے دیار و امصار میں جو صلحاء ملت دور دراز کے سفر کر کے تشریف لائے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد محض دین کی تبلیغ تھی۔ اور ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ انہی کی تبلیغ سے ظلمت کدۂ ہند کا بڑا حصہ اسلام کے نور سے منور ہوا۔ اور خود نبی امی علیہ السلام اِدھر سے اُدھر تشریف لے گئے تاکہ لوگوں کو اللہ کے دین کا پیغام سنائیں اور انہیں ہدایت کی راہ بتلائیں۔

لیکن یہ حیرت کا مقام ہے کہ تبلیغِ دین و احکام الٰہی کی غرض سے تو ایک قدم نہیں اٹھتا حتیٰ کہ یہ فرض اپنے گھر اور گلی میں ہم بھول چکے ہیں، اور ایسے سفر جن کی شریعت مطہرہ نے اجازت نہیں دی وہ بکثرت کیے جاتے ہیں۔

صلحاء امت کی زندگیوں کا مشغلہ تبلیغ دین تھی اور ایسی بے لوث و مخلصانہ کہ کبھی درِ غیر سے ایک دانہ گندم یا ایک لقمہ کی خواہش نہیں کی۔ انبیاء علیہم السلام کی سنت مبارکہ کے مطابق ان کی نظر ہمیشہ اپنے پیدا کرنے والے پر رہی۔ اجر و صلہ کی درخواست اس قادرِ مطلق کے دروازہ پر کی اور بس۔

ہمارے حضرت لاہوری قدس سرہٗ وطن عزیز کے چپہ چپہ پر گئے لیکن کبھی کسی مدرسہ، انجمن، سوسائٹی یا رئیس کے مرہون منت نہیں ہوئے وعدہ یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب مہیا فرما دئے تو بہت اچھا ورنہ معذرت! بڑے بڑے رئیسوں کے یہاں تشریف لے گئے لیکن چنے بھنوا کر پاس رکھ لیے۔ کئی کئی دن قیام رہا لیکن انہی پر قناعت کی۔ کسی کے گھر کا لقمہ نہیں کھایا۔

اہل اللہ کی زندگی کا یہی وہ مبارک کردار جس نے انسانیت کو ان کی طرف متوجہ کیا اور لوگ سوچنے لگے کہ جس نبیٔ امیؐ کے نام لیواؤں کا یہ عالم ہے وہ خود کتنا حسین و جمیل ہوگا؟ اور پھر لوگ اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو گئے ——

مَیں توجہ دلاؤں گا کہ اپنے اکابر کی طرح باتیں کم اور زیادہ عمل کی عادت ڈالیں ایسا کردار اپنائیں کہ لوگ اسلام کا نمائندہ اور ترجمان سمجھ کر اسلام کی طرف متوجہ ہو جائے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اظہارِ تعزیت

چیچہ وطنی کے پرانے جماعتی ورکر اور صالح و مخلص مسلمان چوہدری نبی احمد صاحب کے صاحبزادے (صفدر چودھری کے بھائی) پچھلے دنوں انتقال کر گئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بچہ کو والدین کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ (ادارہ)

خطبۂ جمعہ

ضبط و ترتیب : مولانا عبدالرؤف

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہر نازک مرحلے پر امّت کی رہنمائی کی

○ جانشین شیخ التفسیر حضرۃ مولانا عبید اللہ انور مدّ ظلہم ○

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم : امّا بعد : فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : ـــــ

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ۔

(صدق اللہ العظیم)

محترم حضرات ! سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظمت و سیرت کے چند پہلو آپ کے سامنے پیش کیے گئے۔ کہ آپؓ نے اسلام لانے کے بعد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر معاملے میں سبقت حاصل کی اور ہر قسم کی قربانی دے کر اسلام کے ساتھ لازوال لگاؤ ، اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ بے پناہ محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے دلی عشق کا عملی ثبوت فراہم کیا تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے آپ کو اپنی رضا کا سرٹیفکیٹ بھی عطا فرمایا اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ساری کائنات سے افضل بھی قرار دیا اور پھر حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف مواقع پر اشارتاً آپؓ کو اپنا جانشین قرار دینے کے بعد جب اپنی حیات مقدّسہ کے آخری ایام میں آپؓ کو اپنی جگہ صحابہؓ کا امام بنایا تو یہ بات طے ہو گئی کہ امام الانبیاء حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امّت کی امامت اور خلافت کے صحیح مستحق صرف اور صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

عظیم سانحہ

حضرات مکرم ! حبیب کبریا امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس دنیا سے رخصت ہو کر اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملنا اہلِ اسلام اور صحابہؓ کے لیے اتنا بڑا سانحہ تھا کہ اسے قیامتِ صغریٰ سے کسی طرح بھی کم نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ جن کے لیے صحابہؓ نے اپنا وطن ، کاروبار ، عزیز و اقارب ، ماں باپ ، بہن بھائی ، جان و مال اور اپنی زندگی کا قیمتی سے قیمتی سرمایہ قربان کیا جن کی زندگی کی حفاظت کے لیے احد ، تبوک اور حنین کی لڑائیوں میں صحابہؓ نے پروانہ وار اپنی جانیں نچھاور کر دیں ۔ آج وہ ہی داغ مفارقت دے کر اس دنیائے فانی سے تشریف لے گئے ۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ میں اس صدمہ اور سانحہ کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہ تھا جس نے اس خبر کو سنا اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا ۔ مدینہ منورہ کا ہر مسلمان پریشان تھا کسی نے

دیوار کے ساتھ سر ٹکرا لیا تو کسی نے اللہ تعالیٰ سے آنکھوں کی بینائی واپس لینے کی دعا کی۔ کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان آنکھوں سے کسی کو دیکھنا مشکل تھا۔ مدینہ کی گلیوں سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بڑے بڑے حوصلے اور دل گردے والے صحابہؓ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے غرضیکہ ہر فرد یوں محسوس کرتا تھا کہ آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ لوگ اس خبر کی تصدیق کے لیے مسجد نبوی میں اکٹھے ہو گئے۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا مضبوط الاعصاب اور عقیدے کا پہاڑ انسان تلوار بے نیام کر کے اعلان کرتا ہے کہ خبردار! جس نے یہ کہا کہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں میں اُس کی گردن اتار دوں گا"

ایسے نازک مرحلے پر مسلمانوں کے عقاید کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو جس شخصیت نے سہارا دیا وہ سیدنا صدیق اکبرؓ ہی کی ذاتِ گرامی تھی۔

عشق اور ایمان کا مقابلہ

کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جس ابوبکرؓ کی دلی خواہش ہی یہ تھی کہ "النظر علی وجہ رسول اللہ" ہر وقت پیغمبر کے چہرہ انور کی زیارت ہوتی رہے اور جو زندگی میں ایک لمحہ کے لئے حضورؐ کی مجلس سے دور اور زیارت سے محروم نہ رہ سکتا ہو۔ اس کے دل پر اس خبر سے کیا گذری ہوگی یہاں عشق اور ایمان آمنے سامنے کھڑے تھے۔ عشق کا تقاضا تھا کہ دیوانہ وار آبادیوں کو چھوڑ کر ویرانوں کو اپنا مسکن بنا لیا جائے یا کم از کم دوسرے صحابہؓ کی طرح رونے دھونے میں مصروف ہو جائیں لیکن مشیت ایزدی حضرت ابوبکرؓ صدیق رضی اللہ عنہ سے بہت بڑا کام لینا چاہتی تھی۔ اور وہ یہ کہ عشق، عقل اور دل کے جذبات کو دین و ایمان کے عقائد و نظریات کے تابع بنا کر نہ صرف خود صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں بلکہ دوسرے مسلمانوں کے اطمینان قلب اور حفاظتِ عقاید کا بھی باعث بنیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ اپنے دل پر غم و رنج کا ایک بہت بڑا بوجھ لیے صبر و استقامت کی عملی تصویر بنے حجرۂ عائشہ صدیقہؓ میں تشریف لے گئے جہاں سیدالکونین علیہ الصلوٰۃ والسلام ابدی آرام فرما رہے تھے پیشانی مبارک پہ بوسہ دیا اور کہا۔ "اے آقا! آپؐ پر جو موت واقع ہونا تھی وہ ہو چکی لیکن ہم آپؐ کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں گے"۔ اور پھر مسجد نبوی میں تشریف لائے تو یہاں کی حالت دیکھ کر سیدھے منبر رسولؐ پہ تشریف لے گئے اور صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے ایک مختصر خطبہ دیا جس میں فرمایا۔ من کان یعبدُ محمدًا فاِنّ محمدًا قد مات ومَن کانَ یعبدُ اللہ فانّ اللہ حیٌّ لا یموت، لوگو! تم میں سے جو آج سے پہلے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا اسے جان لینا چاہیے کہ (اُس کے معبود) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پہ موت واقع ہو چکی اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا اُسے مطمئن رہنا چاہیئے کہ (اُس کا معبود) اللہ تو زندہ ہے۔ اُس پہ کبھی موت واقع نہیں ہو سکتی۔ پھر قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی وما محمدٌ الّا رسول قد خلت ۔ ۔ ۔ تا وسیجزی اللہ الشکرین۔ اور محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رسول ہی تو ہیں۔ آپؐ سے پہلے اور بھی رسول گذر

چکے ہیں سو اگر آپ کا انتقال
ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں
تو کیا تم لوگ (ایمان سے)
اُلٹے پھر جاؤگے؟ اور جو شخص
اُلٹا پھر بھی جائے گا تو اللہ
تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا۔
اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حق شناسوں
کو عوض دے گا۔"

آپؓ کی یہ تقریر اور
قرآن کی یہ آیت سننا تھی کہ
صحابہ کرامؓ میں صدمہ اور غم کے
ساتھ ساتھ ایمان کی ایک لہر
دوڑ گئی۔ اس سانحہ عظیمہ کی
وجہ سے بھولی ہوئی آیت یاد
آگئی تو ایمان و عقیدہ میں
پیدا ہونے والا تزلزل رفع ہو
گیا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ جب
حضرت ابوبکرؓ نے اس آیت کی
تلاوت کی ہمیں یوں محسوس ہوا
کہ یہ آیت ابھی نازل ہو رہی
ہے۔

ہر مرحلہ پر صحیح رہنمائی

اس اہم واقعہ کے بعد ہر
نازک مرحلے پر حضرت ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ نے امّت کی صحیح
رہنمائی فرمائی اور اپنے علم و حکمت
فہم و فراست اور تدبّر و ذہانت
سے ہر مشکل کا بہترین حل قوم
کے سامنے پیش فرمایا۔ ابن عساکر
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا
سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے
بعد نفاق نے سر اٹھایا۔ عرب
کے بعض قبائل مرتد ہو گئے اور
دوسرے بہت سے مسائل پیدا ہو
گئے۔ اتنی مشکلات جمع ہو گئیں
کہ اگر اتنی مشکلات پہاڑ پر پڑتیں
تو وہ بھی اس بار کو نہ اٹھا
سکتا لیکن میرے والد ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ نے زبردست استقلال
سے ہر مشکل کا مقابلہ کیا اور
ہر ایک کا حل نکالا ——— مثلاً
حضور علیہ السلام کے دفن پر
اختلاف ہوا تو بعض نے مکّہ
مکرمہ اور بعض نے جنّت البقیع
وغیرہ میں دفن کا مشورہ دیا
لیکن فیصلہ کن رائے سیدنا
صدیق اکبرؓ نے دی کہ میں
نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ
وسلم) سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ
کے نبی جس جگہ وصال فرمائیں
اسی جگہ انہیں دفن کیا جاتا ہے
اور اسی پر اتفاق ہو گیا۔

پھر تقسیم وراثت کا
مسئلہ پیدا ہوا تو بھی آپؓ کا
فیصلہ تمام صحابہؓ و اہل بیت کے
لیے قابل قبول تھا کہ نبی مکرم
علیہ السلام کے فرمان کے مطابق
انبیاء کرام دولت و جاگیر یا
درہم و دینار ورثے میں چھوڑ
کر نہیں جاتے بلکہ ان کی وراثت
علم ہوتا ہے اور اگر کوئی چیز
دوسری چھوڑ بھی جائیں تو وہ
صدقہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام صحابہؓ
نے اس پر بھی اتفاق کیا۔

خطبہ خلافت

ثقیفہ بنو ساعدہ میں
امتِ مسلمہ کے اہل الرائے اور
اصحاب شوریٰ کی آپؓ کے ہاتھ
پر اتفاقی بیعت خلافت اور پھر
مسجد نبویؐ میں تمام اہل مدینہ
اور باہر سے حضور علیہ السلام
کی آخری زیارت کرنے کے لیے
آنے والے مسلمانوں کی عام بیعت
کے بعد متفقہ جانشینِ رسولؐ اور
خلیفہ کی حیثیت سے جو خطبہ
خلافت آپؓ نے ارشاد فرمایا۔
اس کا ایک ایک جملہ قیامت تک
آنے والے سربراہانِ مملکت کے
لیے ایک مثالی نمونہ اور اسلامی
حکومت کی اساسی حیثیت کا حامل
ہے، مسلمان قوم کے موجودہ
سربراہوں کو اپنی حکومتوں میں
ظلم و استحصال کے خاتمے اور امن و
سلامتی کے قیام کے لیے آپؓ کے
خطبۂ خلافت کو ایک مثال
بنانا ہوگا۔

چنانچہ حمد و صلوٰۃ کے
بعد فرمایا:۔

"لوگو! میں اگرچہ تمہارا
امیر ہو گیا ہوں مگر میں تم سے

بہتر نہیں ہوں لیکن قرآن شریف
نازل ہو چکا ہے اور نبی مکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں
اپنی سنتوں پر چلنا سکھا دیا
اور ہم اچھی طرح احکامِ شریعت
جان بوجھ گئے۔

پس اے لوگو! سمجھ لو
کہ دانش مند وہی ہے جو متقی
ہے اگر میں نیک کام کروں تو
تمہارا فرض ہے کہ میری اطاعت
اور امداد کرو اور اگر غلط راستے
پر چلوں تو یہ بھی تمہارا فرض
ہے کہ مجھے سیدھے راستے پر
چلاؤ۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ
خیانت۔ تمہارا کمزور شخص بھی
میرے نزدیک طاقتور ہے۔ جب
تک میں دوسروں سے اس کا
حق نہ دلوا دوں اور تمہارا
طاقتور شخص بھی میرے نزدیک
کمزور ہے جب تک اُس سے
دوسروں کا حق نہ لے لوں۔
جہاد کو نہ چھوڑنا کہ جو قوم
جہاد ترک کر دیتی ہے خدا اُسے
ذلیل کر دیتا ہے اور جو قوم
بدکاری میں مبتلا ہو جاتی ہے خدا
اس پر مصیبت نازل کر دیتا
ہے ـــــ لوگو! جب تک میں
خدا اور رسولؐ کی اطاعت کروں
تم میری اطاعت کرو اور جب
نافرمانی کروں تو میرا ساتھ چھوڑ
دو کیونکہ اس صورت میں تم پر
میری اطاعت فرض نہیں۔"

محترم سامعین! جانشینِ
رسولؐ اور خلیفہ اوّل حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی
سربراہِ حکومت کی حیثیت سے
پہلی پالیسی تقریر پر غور کریں
تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ
نے اسلامی حکومت کی بنیاد کن
اصولوں پر رکھی اور پھر ان
رہنما اصولوں پر عمل پیرا ہو کر
آپ نے کس طرح کامیاب حکومت
کی۔ آج بھی اگر آپؓ کے خطبہ
خلافت کو رہنما اصول کے طور
پر اپنا لیا جائے تو ہر قسم کے
ظلم، سرکشی اور برائی کا خاتمہ ہو
سکتا ہے تمام فتنے خود بخود ختم
ہو سکتے ہیں لیکن اس معاملہ میں
اصل مسئلہ خوشنما تقریروں سے
نہیں عملی اقدام سے حل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے
کہ ہمیں خلافت راشدہ کے سنہری
دورِ حکومت کو مثال بنا کر اپنے
یہاں وہی نظامِ عدل قائم کرنے
کی توفیق عطا فرمائیں جس کو

صدیق اکبرؓ
نے اپنے
خطبۂ خلافت
میں واضح فرمایا۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

دردمندانہ اپیل

مدرسہ قاسم العلوم نعمان پورہ باغ
عرصہ سولہ سال سے مسلسل تعلیمی و تبلیغی
خدمات انجام دے رہا ہے۔ طلباء کی
رہائش گاہیں اور تعلیم گاہیں ناکافی ہونے
کی وجہ سے تعلیمی فرائض انجام دینے میں
سخت دشواریوں کا سامنا ہے۔

چار کمروں کی تعمیر دیواروں تک
ہو چکی ہے مگر چھت کے لیے لنٹر پر تقریباً
۷۰ من لوہا کی ضرورت ہے۔ اربابِ
دولت اور مخیر حضرات سے اپیل ہے کہ
وہ اس کارِ خیر میں ادارہ ہذا کی امداد
فرمائیں۔ محمد امیر النعمان
ناظم مدرسہ قاسم العلوم نعمانپورہ
باغ۔ پونچھ۔ آزاد کشمیر

ماہانہ مجلسِ ذکر

انشاء اللہ تعالیٰ حسب سابق
ماہانہ مجلس ذکر مسجد خضراء سمن آباد
لاہور میں یکم جون سنہء بروز اتوار
بعد نماز مغرب زیر صدارت حضرت
مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم
منعقد ہوگی۔ دعوت عام ہے۔

تحریک ۱۸۵۷ء میں علماء کا کردار

۱۱-مئی [illegible] کو نیشنل سنٹر لاہور میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں ایک نشست منعقد ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید تھے، اسمیں مولانا عبدالرؤف فاروقی جنرل سیکرٹری کاروان اہلسنت پاکستان نے یہ مقالہ پڑھا اور داد حاصل کی

ادارہ

آزادی وطن کی خاطر جو تحریکیں مختلف اوقات میں ابھریں، ان میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی (جسے انگریز غدر کا نام دیتا ہے) بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تحریک پورے برصغیر میں پھیلی اور گو کہ وقتی طور پر خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے لیکن آزادی وحریت کی تاریخ میں اہل جنوں نے جو باب اپنے خون سے رقم کیا وہ اپنی مثال آپ ہے ـــ مشہور اہل قلم جناب باری علیگ نے "کمپنی کی حکومت" میں اس تحریک کا پس منظر طویل تاریخی عوامل کو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مغل نظام حکومت جو جاگیرداری نظام کا نکتہ عروج تھا وہ غایت درجہ کمزور ہو چکا تھا اور اب ۱۸۵۷ء میں اس مٹتی ہوئی جاگیر شاہی نے انگڑائی لی، (صـ۳۵۶)

باری مرحوم کے خلوص پر شبہ کرنا درست نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ تاریخ میں اس نقطہ نظر کے حامل تھے جسے جدلیاتی نقطۂ نظر کہا جاتا ہے اس لئے انہوں نے حالات کا اس انداز سے تجزیہ کیا اور اس ملک گیر تحریک کو مغل جاگیر شاہی کو بچانے کا ایک ذریعہ قرار دیا، جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ انگریز کی آمد کے ساتھ ہی یہاں کے اہل دانش وبینش اور ارباب علم وفضل نے خطرات محسوس کرنا شروع کر دیئے تھے، انہی خطرات نے آئندہ چل کر واقعات کا روپ دھار لیا اور پھر ان حالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کا سلسلہ شروع ہو گیا"

انگریزی عفریت کا سب سے پہلے خطرہ محسوس کرنے والے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ تھے ان کے بعد حضرت الامام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ محدث دہلوی، جن کے متعلق امام انقلاب مولانا عبید اللہ صاحب سندھی ؒ کی رائے یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی ؒ کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا، شاہ صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس تحریک کو آگے بڑھایا جو چیز اب تک علم وفکر کے دائرہ میں تھی اب عمل کے دائرہ میں آئی اور اس نے تحریک جہاد کا روپ دھار لیا، اس تحریک کا پہلا دور ہی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں [illegible] ختم ہو گیا، لیکن یہ ایک عہد اور ایک دور کا اختتام تھا، تحریک زندہ تھی اور زندہ رہی تا آنکہ انگریز یہاں سے رخصت ہو گیا،

۱۸۳۱ء کے حادثہ کے بعد چھوٹے موٹے جو معرکے بپا ہوئے ان کو چھوڑ کر جو ملک گیر اور زبردست معرکہ بپا ہوا وہ ۱۸۵۷ء کا ہے اس تحریک کے متعلق خود ڈاکٹر ہنٹر کا اعتراف ہے کہ اس میں سید صاحب کی تحریک جہاد کی بچی کچھی چنگاریاں کام کر رہی تھیں،

(ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ صـ۲۹)

اس تحریک کے قائدین میں جنرل بخت خان اور مولانا لیاقت علی الہ آبادی جیسے حضرات کے نام سرفہرست ہیں، محترمہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی اپنی کتاب "۵۷ء کے ہیرو" میں صـ۹۶ پر خواجہ حسن نظامی مرحوم کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ "بخت خان خود بھی وہابی تھے اور محمد رفیع رسالدار، مولوی امام خان، عبدالغفور خان مولوی سرفراز علی بھی وہابی تھے، بخت خان نے مولوی سرفراز علی کو پیشوائے مجاہدین مقرر کیا تھا اور وہی ان کی سرپرستی کرتے تھے"

اس موقعہ پر بطور جملہ معترضہ یہ کہنا ضروری ہے کہ مجاہدین کو وہابی کہنا اس دور کا رواج ہو چکا تھا اور یہ بات انگریز شدہ دماغوں کی گھڑی ہوئی تھی، جنہوں نے "سلطنت خداداد" کے مصنف محمود بنگلوری کے بقول ٹیپو سلطان شہید کو بھی وہابی مشہور کیا تھا اور تحریک مجاہدین کا سب سے بڑا دشمن ہنٹر جگہ جگہ ان قدسیوں کو

وہابی کہتا ہے اور یہ جملہ بھی اسی کے قلم سے نکلا ہے کہ "وہابی اور غدار مترادف الفاظ ہیں،" جس سے "وہابیت" کی اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے۔"

بہرحال ہنٹر یہ کہتا ہے کہ اس تحریک میں سید صاحب کی تحریک کی بچی کھچی چنگاریاں کام کر رہی تھیں، اور خواجہ حسن نظامی "یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ جو قائدین کی فہرست میں شامل تھے جن میں سپہ سالار عام جنرل بخت خان بھی ہیں یہ سب وہابی تھے بالفاظ دیگر اسی تحریک جہاد کے تربیت یافتہ میاں محمد شفیع مرحوم لکھتے ہیں کہ

"تمام انگریز یک زبان ہو کر لکھتے ہیں کہ غدر کے روح رواں مسلمان تھے وہ ہر جگہ انگریز کے خلاف نعرے لگا رہے تھے ان کی کوشش سے سرحد کے میدان اور گھاٹیاں (یہ جملہ بطور خاص قابل توجہ ہے کہ یہاں سید صاحب کے باقی رفقاء کی جہادی یاں تھیں) نائرہ جنگ بنی ہوئی تھیں جنہوں نے بار بار کی مہموں کو ناکام کر رکھا تھا"

(۱۸۵۷ء صفحہ ۱۵۳)

آگے چل کر میاں صاحب نے ہنٹر کے بعض اقتباسات نقل کئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ متعصب مسلمان تو کھلم کھلا بغاوت میں مصروف تھے اور باقی تمام بھی علانیہ فرضیت جہاد کی بحث میں مصروف! اور تیتو میاں جس کا تعلق حضرت سید صاحب کی تحریک سے بالکل واضح ہے ہنٹر اس پر دانت پیستا ہے کہ وہ ایک معمولی آدمی ہے لیکن اب مسلمانوں کا لیڈر بن گیا ہے۔"

معین الدین حسن خان اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ

"بعض نے بتایا کہ غدر اس قومی تحریک کا نتیجہ تھا جس کا مقصد غیر ملکی حکومت سے ہندوستان کو آزاد کرانا اور از سر نو اسلامی حکومت قائم کرنا تھا"

سر جان آوٹرم کے بقول،

"بغاوت کی تحریک کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے بہت عرصہ قبل شروع ہو چکی تھی"

اور مٹکاف لکھتا ہے کہ،

"بعض کی رائے میں غدر خالصتہً اسلامی بغاوت تھی"

مزید اس کا خیال ہے کہ

"مسلمان اپنی جنگجویانہ روایات کا خیال کرتے ہوئے اپنے گذشتہ بادشاہوں کی عظمت و جلال کا خواب دیکھ رہے تھے اور روزانہ اپنی سلطنت کی بحالی کے لئے دعا مانگا کرتے تھے"

مٹکاف نے مزید لکھا ہے کہ،

عام خیال یہ ہے کہ مسلمان محرک تھے اور انھیں نے ہندوؤں کو شامل ہونے کی ترغیب دی"

مسلمان قوم جس سانچے میں ڈھلی تھی اس کا اندازہ لکھنؤ کے ایک کتب فروش سے ہو سکتا ہے جسے پھانسی کی سزا دیگئی تو کہا گیا کہ دوسرے مجرموں کے نام بتا کر اپنے آپ کو بچالو اس نے جواب دیا کہ،

زندگی میں بعض موقعے زندگی بچانے کے آتے ہیں اور بعض قربانی کے، یہ موقع میری قربانی کا ہے"

لکھا ہے کہ پھانسی پر چڑھتے وقت اس مجاہد نے کہا،

"تم مجھے پھانسی دے سکتے ہو اور میری طرح دوسرے لوگوں کو بھی لٹکا سکتے ہو لیکن ہمارے مقصد کو پھانسی نہیں دے سکتے، جب میں مر جاؤں گا تو مجھ جیسے ہزاروں محب وطن میرے خون سے اٹھینگے اور تمہاری حکومت کو برباد کر دینگے"

یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے، اثر کئے بغیر نہ رہ سکے" ساورکر دشمن ہونے کے باوجود اعتراف کرنے پر مجبور ہے"

"ان پیغمبرانہ الفاظ کے بعد وہ سچا محب وطن بغیر اس کے کہ وہ اپنے ملک کے چہرے پر غداری کا داغ ڈالے موت کے دروازے سے ہوتا ہوا شہیدوں کے اس گروہ سے جا ملا جو غیر فانی یاد میں رہتے ہیں" یہ نامناسب نہیں ہوگا کہ اس موقعہ پر رانی لکشمی بائی کا یہ مقولہ درج کر دیا جائے جس میں اس نے کہا اور اس وقت کہ جب اسے ہتھیار ڈالنے کو کہا گیا، "جب ہر زندہ کے لئے موت ہے تو عزت کی موت بہت بہتر ہے"

یہ تفصیلات بہرحال اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ امام ولی اللہ نے جو فکری مشعل روشن کی اور جسے حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ اور ان کے رفقاء نے عمل کا رنگ دیا اس کی بچی کھچی چنگاریاں یہاں کام کر رہی تھیں اور یہ چنگاریاں ان غریب علماء کی شکل میں تھیں جنکا ذکر آپ حسن نظامی مرحوم کے حوالے سے سن چکے ہیں ایک اور مولوی کا ذکر سنتے چلیں جو اودھ کی تحریک کا روح رواں تھا، یعنی مولوی احمد اللہ صاحب"

انگریز مورخ، میلسن، معترف ہے کہ سر کون

کیمبل جیسے شخص کو میدان جنگ میں دو مرتبہ نیچا دکھانے کا سہرا اسی مولوی کے سر ہے اور وہ اعتراف کرتا ہے کہ ناجائز قتل و غارتگری سے اس مولوی صاحب کی تلوار کبھی آلودہ نہیں ہوئی بلکہ انتہائی مردانگی و عالی حوصلگی سے میدان جہاد میں لڑنا ان کا شیوہ تھا،،

اوڈ ہومز،، تاریخ غدر صفحہ ۵۳ پر لکھتا ہے کہ اگر اس وقت ہندوستان میں کوئی لیاقت مند آدمی تھا تو وہ مولوی صاحب تھے اگر تاج شاہی ان کے سر پر رکھ دیا جاتا تو وہ اس کا استحقاق رکھتے تھے،

بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں سرکاری وکیل کی بات فیصلہ کن ہے وہ کہتا ہے،،

،،غدر پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں بے غرضانہ اتفاق تھا فوج میں وہ بھائی بھائی تھے باہم تہواروں میں شریک ہوتے تھے لیکن گورنمنٹ کی غفلت نے اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا، ویسے جنگ کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر پر تھی کیونکہ انہیں اپنی سلطنت کے دوبارہ قیام کے امکانات روشن ہوتے کی امید ہو گئی تھی،،

(بہادر شاہ کا مقدمہ از حسن نظامی مرحوم)

جنگ کی ذمہ داری مسلمانوں کے سر کیوں؟ اسی لئے کہ وہ اپنی دینی روایات کے طور پر غلامی کو حرام اور گناہ سمجھتے تھے،

قادیانی تحریک کا پس منظر بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کے جذبات جہاد فنا ہوں اور وہ غلامی پر قناعت کرنے کے خوگر بن سکیں، چنانچہ بانی تحریک کی تعلیمات کا اکثر حصہ اسی محور کے گرد گھومتا ہے

لیکن سچے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا موقف بالکل واضح تھا، پھر پچھلے ایک عرصے سے برصغیر کے مختلف حصوں میں آزادی کی جو جنگیں لڑی گئیں اس کے ہیرو مسلمان تھے علماء کی فکری اور عملی قیادت ان کی پشت پر تھی اب بھی علماء قافلہ سالار تھے کچھ حوالے آپ کی نظر سے گذرے، مزید یہ ذہن میں رکھیں کہ تحریک ۵۷ وہ پھیلی اور بڑھی اس وقت جب وہ عظیم الشان فتویٰ سامنے آیا جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنی جا رہی ہے اس فتوی پر دستخط کنندگان کی فہرست ملاحظہ فرمائیں اس میں آپ کو وہ لوگ نظر آئیں گے جو ایک آدھ واسطہ سے حضرت سید احمد شہید اور آپ کے رفقاء کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے، مفتی صدر الدین صاحب آزردہؒ کی فتویٰ جہاد کے سلسلہ میں جو اہمیت ہے اس سے ایک زمانہ آگاہ ہے، مولانا احمد اللہ شہید جب دہلی پہنچے تھے تو شیخ صاحب کا چار سو چرچا تھا آپ حضرت شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص تھے جو سید صاحب کے بعد دہلی مرکز کے فکری و علمی رہنما اور قائد تھے اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ علیہ الرحمۃ حکیم مومن خاں مومن قدس سرہ کے فیض یافتہ تھے جو سید صاحب کے عاشق زار خادم تھے مومن سید صاحب کے متعلق کہتے ہیں کہ،،

،،جو سید احمد امام زمان و اہل زمان
کرے ملاحدے دین سے ارادہ جنگ

مزید کہتے ہیں،،

وہ کون امام جہاں وجہانیان احمد
کہ محض مقتدی سنت پیمبر ہے

بہر حال یہ تحریک جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور انگریزی راج کو ہلا کر رکھ دیا ایک تاریخی تسلسل کا حصہ ہے اور یہاں بھی علماء قائدانہ طور پر شریک ہیں ــــ اور اس واقعہ کا انکار ممکن نہیں کہ ۶۰ ہزار سے زائد علماء کو اس دور میں پورے ملک میں پھانسی پر لٹکایا گیا لیکن ان میں سے ہر فرد اپنے خون مقدس سے جو مشعل جلا گیا اسے کوئی نہ بجھا سکا اپنے اس مقالہ میں ۱۸۵۷ء کے جہاد کے ایک حصہ سے متعلق چند باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں، جو تاریخ میں جہاد شاملی کے عنوان سے معروف ہے،،

ہماری مجرمانہ غفلت کا یہ عالم ہے کہ ہم نے آزادی کی داستان کے متعلق کوئی مربوط و مسلسل کام نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ بچوں کا کھیل بن کر رہ گئی ہے اور جس کے جی میں جو آتا ہے لکھ دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے ــ جہاد شاملی جس توجہ کا مستحق تھا وہ نہیں کی گئی،

جو علاقے اس جہاد کا مرکز تھے یعنی سہارنپور مظفر نگر وغیرہ، یہ ایسے علاقے تھے جہاں حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے وسیع اثرات تھے، ـــــ ارمغان احباب کے فاضل مصنف مولانا سید عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ،،

،،تقریباً ایک صدی بعد، اس وقت تک ہمارا یوپی کے جس قدر قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں ہر فرد و بشر کو سید صاحب کا دم بھرتے پایا ہے جو ہے ان کی محبت میں چور ہے، میں نے اپنی عمر میں سید صاحب

کا اتنا چرچا کہیں نہیں دیکھا،،

اور جہاد شاملی کے ذمہ دار وبانی حضرات تو براہ راست اس تحریک سے وابستہ تھے،،

اس جہاد میں امیر المجاہدین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ تھے ان کی تین سال کی عمر تھی جب سید صاحب نے اس علاقہ کا دورہ کیا تو حاجی صاحب کو گود میں لیکر پیار دیا، حاجی صاحب کے شیخ الشیخ شاہ عبدالرحیم شہید بالاکوٹ سید صاحب کے خلیفہ اور ہمراز تھے، بالاکوٹ تک ساتھ رہے اکٹھے ہی جام شہادت نوش کیا، حاجی صاحب اور آپکے تمام رفقاء کا سلسلہ سند حدیث نیز سلسلہ اسند طریقت براہ راست ان حضرات سے ملتا ہے،، **جہاد شاملی** کے دو اہم رفقاء حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما اس سلسلہ علم کی دو زبردست شخصیتیں ہیں جن پر علم بجا طور پر فخر و ناز کرتا ہے اور ان کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ان پر ناز کرتے تھے،،

مولانا عبید اللہ سندھی جیسے مبصر و مفکر نے جہاد شاملی کے سربراہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے متعلق لکھا ہے کہ،،

،، امیر شہید حضرت سید احمدؒ سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے اس لئے وہ سید صاحب کا نمونہ تھے،، (سیاسی تحریک صد ۱۸۳)

تو مولانا سندھی ہی کی تحقیق ہے کہ سن ۱۲۶۰ھ میں جب حضرت حاجی صاحب پہلی مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے تو تحریک کے مسلمہ قائد شاہ محمد اسحاق قدس سرہ نے آپ کو اس کام کے لئے باقاعدہ مامور فرمایا چنانچہ سن ۱۲۶۲ھ میں جب آپ حج سے واپس آئے تو وہ لوگ جو اس سلسلہ سے وابستہ تھے انہوں نے حاجی صاحب کو اپنے تعلقات کا مرکز بنا لیا، اکابر اہل علم مثلاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور ان کے علاوہ علماء ہند کی ایک بڑی جماعت آپ کے گرد جمع ہو گئی تھی،، سیاسی تحریک ۱۸۳

دور حاضر کے نامور محقق و مؤرخ مولانا سید محمد میاں دیوبندی قدس سرہ کی تحقیق یہ ہے کہ رمضان شریف کے آخر میں جوں ہی دہلی سے اس انقلاب ۱۸۵۷ء کی خبر پہنچی تو غور و خوض کا اہم موضوع سامنے آگیا، چنانچہ نانوتہ سے مولانا محمد قاسم کو گنگوہ سے مولانا رشید احمد کو اور سہارنپور سے مولانا محمد یعقوب صاحب (اولین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند ابن استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی رح) کو تھانہ بھون بلایا گیا اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (مہاجر مکی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ) کو حالات کی تحقیق کیلئے دہلی بھیجا گیا مئی ۱۸۵۷ یا جون کی ابتداء میں مولانا دہلی پہنچے،،
(شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۶۵)

اس کے بعد باقاعدہ نظام تجویز کیا گیا حاجی صاحب امیر مقرر ہوئے جبکہ مولانا نانوتوی مولانا گنگوہی، حضرت حافظ ضامن شہید اور مولانا محمد منیر جیسے حضرات کو فوج، حفاظت، فصل خصومات، اور عدل و قانون کے شعبے سپرد کئے گئے، نواب شبیر علی صاحب مراد آبادی جو بہادر شاہ ظفر کے منہ چڑھے اور بے تکلف تھے وہ ان حضرات اور بادشاہ کے درمیان رابطہ کا ذریعہ تھے (سوانح قاسمی ج ۲ صفحہ ۱۲۷ کی روایت یہ ہے کہ نواب شبیر علی کو دہلی بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ اپنی سپاہ سمیت دہلی سے شاملی کی طرف یلغار کریں اور یہ حضرات اس طرف سے،،

نواب شبیر علی کے متعلق جو یہ روایت ہے کہ انہیں بادشاہ کو اس تحریک میں شرکت پر آمادگی کے لئے بھیجا گیا تھا درست نہیں ہے کیونکہ وہ تو شریک تھے ہی یہ دوسری روایت زیادہ معتبر اور صحیح ہے کہ دو طرفہ یلغار ہو، اس کے علاوہ حضرت شاہ حسن عسکری رح جو بادشاہ کے پیر اور اس تحریک کے محرک اولین گنے جاتے ہیں وہ اسی علاقہ کے رہنے والے تھے اور ان بزرگوں سے ان کے خاندانی مراسم تھے، وہ بھی رابطہ کا ایک ذریعہ تھے،،

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی واپسی کے بعد بادشاہ کو نیک مشورے دینے کے ساتھ ساتھ عملی جہاد کیا گیا یہ بات بھی قریباً قریباً طے شدہ ہے کہ یہ حضرات دہلی بھی گئے تھے اور مشوروں میں شریک ہوئے تھے،، رحمت اللہ نامی جس بزرگ کے فتویٰ جہاد پر دستخط ہیں وہ مولانا کیرانوی ہی ہیں جو اس تحریک کے ذمہ دار کارکن تھے

مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی نے شوریٰ کے اجلاس میں بے سرو سامانی کی وجہ سے عملی اقدام سے گریز کا مشورہ دیا لیکن مولانا نانوتوی نے فرمایا کہ، کیا اتنا بھی سامان نہیں جتنا غزوہ بدر میں تھا؟ تو اس کے بعد ظاہر ہے کوئی جواب نہ تھا، اب نصب امام کا عندیہ پیش کیا گیا تو حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی اس کے بعد عملی جہاد کا سلسلہ شروع ہوا، مولانا نانوتوی کے سوانح نگار کے بقول اقدام قبلہ نما دہلی تھا چنانچہ سر فروشان دین و وطن سر ہتھیلی پر رکھ

(باقی ۲۴ پر)

ابوالکلامیات

مرسلہ
ڈاکٹر شبیر بہادر خان
پنی — ایبٹ آباد

حجتِ ابراہیمی

مولانا ابوالکلام آزاد رح

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اقبال رح)

آپ کی ذات علم کا بحرِ بیکراں تھی، اس کا اعتراف وقت کے اہلِ علم نے کیا "

علامہ شبلی رح نے فرمایا کہ "ابوالکلام الفاظ کا بادشاہ ہے اور میں ایجاز کا"

میں نے ایک دفعہ مولانا عبدالقادر قصوری رح سے مولانا آزاد کی نگارشات کی بوقلمونی اور اثر پذیری کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا "یہ سب علمی نوادر ماضی کے علماء اسلام کے ہاں کسی نہ کسی رنگ میں موجود تو ہیں لیکن اسلامی علوم کے اس پربہار گلستان سے ایک دلفریب گلدستہ بنانا مولانا آزاد جیسے ماہرِ باغبان کا ہی کمال ہے اور یہ کمال ان کی ذات پر ہی ختم ہو گیا"

مجھے اس سمندر سے چند موتی بہ قدرِ ظرف اپنے جیب و دامن میں بھر رکھے ہیں اور چاہتا ہوں کہ گاہے گاہے ان اقتباسات کو خدام الدین کے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کروں "

آج کی مجلس میں "الہلال" سے حجت ابراہیمی کا اقتباس پیش کرتا ہوں "

اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ۲۸-۵۶

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھِیْمَ کی تفسیر کے تحت الہلال ۱۹۲۷ء میں تحریر فرمایا — "انبیاء کرام کے اعمال دعوت کے لئے، اگر انسانوں کے کسی عمل سے مشابہت پیدا کی جا سکتی ہے تو وہ حکماء کی حکمت اور مناظرین کا مناظرہ نہیں، اطباء کا معالجہ ہے۔ طبیب جسم کا علاج کرنا چاہتا ہے "، انبیاء روح و دل کا روگ دور کرنا چاہتے ہیں " ان کا سلوک بھی اپنے مریضوں کے ساتھ ہمیشہ وہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک طبیب کا ہونا چاہئے وہ مریض سے مناظرہ کرنا نہیں چاہتے اسے تندرست کرنا چاہتے ہیں وہ بسا اوقات علم و یقین کی ایک دماغی غذا مریض کے سامنے رکھتے ہیں اور وہ غذا ہر طرح مفید اور بہتر سے بہتر ہوتی ہے لیکن انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جہل و ضلالت نے مریض کی فکری حالت اس درجہ خراب کر دی ہے کہ یہ غذا اس کا دماغ ہضم نہیں کر سکتا، یعنی اس کی سمجھ کی کجی اور دل کی گمراہی ساتھ نہیں دیتی، جوں ہی انہیں اس حالت کا احساس ہوتا ہے ایک طبیب حاذق کی طرح فوراً غذا بدل دیتے ہیں اور کوئی دوسری غذا جو اس کا معدۂ فکر ہضم کر سکے سامنے رکھ دیتے ہیں، انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں ہوتی کہ پہلی غذا کیوں بدلنی پڑی —؟ اس لئے کہ مقصود کسی خاص غذا کا کھلا دینا نہیں ہے بلکہ ایسی غذا کا کھلانا ہے جو مریض ٹھیک طور پر ہضم کر سکے، ہضم کی استعداد کے لحاظ سے ہر مریض کی حالت یکساں نہیں ہوتی ایک مریض کے لئے دودھ سے زیادہ زود ہضم غذا کوئی نہ ہوگی، لیکن یہی دودھ دوسرے مریض کے لئے ناقابلِ ہضم ہوگا، جو حال جسم کے لئے معدہ کا ہے وہی حال دماغ کے لئے فکر کا ہے، ذہن و فکر کا ایک مریض ایسا ہوگا جو ایک خاص طرح کی دانائی قبول کر سکتا ہے لیکن ایک دوسرے بیمارِ دل کے لئے وہی بات ناقابلِ فہم ہوگی، انبیاء علم و یقین کی بہتر سے بہتر دانائی رکھتے ہیں لیکن دماغ و فکر پیدا کر کے دے نہیں سکتے، دودھ کے بہتر غذا ہونے پر کون حرف لا سکتا ہے؟ لیکن اس کا کیا علاج کہ ایک بدنصیب مریض نے اپنا معدہ کھو دیا ہے اور وہ دودھ جیسی زود ہضم اور عمدہ غذا بھی ہضم نہیں کر سکتا یہی معنی ہیں اس آیت کریمہ کے انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشآء وھو اعلم بالمھتدین ۲۸-۵۶

حالانکہ انبیاء کرام کے ہادی ہونے پر خود قرآن

بار بار شہادتیں دے چکا ہے وانک لتھدی الی صراط مستقیم (۴۲-۵۲) تو مطلب یہی ہے کہ پہلی قسم کی آیات میں استعداد وقابلیت خلق کرنے کی نفی ہے اور دوسری قسم کی آیات میں استعداد رکھنے والوں پر سچائی کی راہ کھول دینے کا اثبات ہے۔"

بابل کا طبیب حق

کئی ہزار برس گذرے اس بیمارستان ہستی میں ایک طبیب حق، ابراہیم خلیل اللہ بھی تھے ان کا سابقہ بابل کے ایک مریض سے پڑا، یہ پادشاہی کے گھمنڈ کا روگی اور جہل وطغیان کی بیماری سے بدحال تھا انہوں نے اس کے سامنے علم وبصیرت کی ایک غذا رکھی "ربی الذی یحیی ویمیت" میرا تو اس پروردگار پر ایمان ہے جس کے قبضہ وتصرف میں ہماری موت وحیات ہے"

یہ بہتر سے بہتر غذا تھی جو شک وانکار کے کسی مریض کے لئے ہو سکتی ہے لیکن مریض اپنے معدہ کی صلاحیت بالکل کھو چکا تھا وہ اتنی ہلکی اور سادہ غذا بھی ہضم نہ کر سکا، جہل وطغیان کے ہیجان میں بول اٹھا، انا احی وامیت اگر تمہارے پروردگار کی یہی صفت ہے، تو یہ بات تو مجھے بھی حاصل ہے، لاکھوں انسانوں کی جان میرے قبضہ واختیار میں ہے جسے چاہوں ہلاک کر ڈالوں جسے چاہوں زندگی بخش دوں"

یہ جواب سن کر حضرت ابراہیم کو معلوم ہو گیا کہ غذا اگرچہ بہتر تھی لیکن مریض کے معدے میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اسے ہضم کر سکے انہوں نے فوراً پہلی قاب ہٹالی اور ایک دوسری غذا پیش کر دی "فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بہا من المغرب" اچھا اگر ایسا ہی ہے تو دیکھو یہ سورج جو ہمارے سروں پر چمک رہا ہے یہ ہر روز پورب سے نکلتا ہے اور پچھم کی طرف ڈوب جاتا ہے تم اسے ایک مرتبہ پچھم سے نکال دکھاؤ!

یہ غذا، ٹھیک اس کے معدہ کی استعداد کے مطابق تھی حلق سے اتری اور ہضم ہو گئی "فبھت الذی کفر" اب اس میں کج بحثی کا دم خم نہ رہا دم بخود ہو کر رہ گیا

دار العلوم دیوبند مشہور اخبارات و رسائل کی نظر میں

مولانا بشیر احمد قادری، مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی، ضلع بہاولنگر

روزنامہ زمیندار

برصغیر پاک و ہند کے مشہور صحافی، صاحب طرز ادیب، اور معروف شاعر مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر روزنامہ "زمیندار" لاہور نے اپنے اخبار گوہر بار میں دار العلوم دیوبند کے بارے میں اپنے تاثرات و احساسات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا،

"اس وقت ہندوستان کے طول عرض میں علوم دینیہ سے واقف جتنی ہستیاں نظر آتی ہیں، ان میں بڑا حصہ اسی دریائے علم (دار العلوم دیوبند) سے سیراب ہو کر نکلا ہے ہندوستان کے بڑے بڑے علماء نے اسی مہتم بالشان مدرسہ میں زانوئے ادب تہہ کیا ہے، اور درحقیقت علمی خدمات کی گراں مائگی میں ہندوستان کی کوئی درسگاہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی ایک دو مستثنیات کو چھوڑ کر کوئی دار العلوم ایسا نہیں جو اس سے ٹکر کھا سکے اور جس نے ملت بیضاء اسلامیہ کی اتنی اہم خدمات انجام دی ہوں"

(روزنامہ زمیندار لاہور ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)

روزنامہ سیاست لاہور

روزنامہ سیاست کے مدیر شہیر، سید حبیب دار العلوم دیوبند کی خدمات جلیلہ، تحفظ دین اور اصلاح مسلمین کے سلسلہ میں دار العلوم کے عظیم و جلیل فرزندوں کے فقید المثال کارناموں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین دین اور اصلاحِ مسلمین کا تعلق ہے دار العلوم دیوبند کے مدرسین و مبلغین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے، مثال کے طور پر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کر لیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں تو آپ کو روز روشن کی طرح نظر آئیگا کہ ان مساعی کے مقابلہ میں سب سے نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہی ہے اور دعوی سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں دین حنیف، علوم دینیہ، تفسیر و حدیث اور فقہ کے چرچے بعونہٖ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں"

(روزنامہ سیاست لاہور ۲ جون ۱۹۲۳ء)

اخبار عصر جدید کلکتہ

کلکتہ کے مشہور و معروف اخبار "عصر جدید" کے ایڈیٹر نے دار العلوم دیوبند کی عظیم خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا

"دار العلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے ہندوستان کے طویل و عریض براعظم کا ایک ایک گوشہ اسکی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جبکہ دنیاوی عزت، مناصب کی کشمکش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، اور جبکہ لوگ مذہب سے بے پرواہ اور مذہبی تعلیم سے غافل ہو چکے تھے، اور قال اللہ و قال الرسول کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقارخانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم و تمدن کے شور و غوغا سے دب چکی تھی،

اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن و حدیث کے علم کو سنبھالے کھڑا رہا، ملک، کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھیوں نے رہ رہ کر اس کو گرا دینا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا، فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو قدامت سے منحرف نہ کر سکی، نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اسے اپنی رو میں بہا کر لیجائے مگر کس مپرسی کے باوجود ایک طرف اپنے اندرونی و بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر گوشہ میں پہنچاتا رہا، یہاں تک کہ مسلسل جد و جہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز موصل، بخارا، اور اسلامی دنیا کے ہر حصے

سے خدایان قرآن و حدیث اکثر پروانہ
دار اس کے گرد مجتمع ہیں ،،

روزنامہ عصر جدید کلکتہ مورخہ ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

دار العلوم دیوبند

روزنامہ دعوت دہلی کے امتیازات

وخصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز
ہے کہ ،،

دار العلوم دیوبند ہمارے پاس ایک صدی
کی امانت ہے ، ایشیائی ممالک میں یہ واحد
ادارہ ہے ، جو ہر سال تقریباً پندرہ سو طلباء
کی کفالت اور تعلیم کی پوری ذمہ داری لیتا
ہے اس طرح کہ کبھی سرکار سے اس نے
ایک پیسہ کی مدد نہیں لی ، دار العلوم دیوبند
میں ایشیائے کوچک سے لیکر حجاز اور شام و عراق
تک کے طلبائے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے
تھے ، اور یہاں کے فارغ شدہ طلباء ان
ملکوں میں پہنچ کر اپنے تبحر علمی کا سکہ بٹھاتے
تھے ، ہند و پاک میں مدرسوں کی معلمی اور
مسجدوں کی امامت وخطابت کے اہم
مناصب آج بھی بیشتر اسی دار العلوم
کے فارغ شدہ طلباء کے ہاتھوں میں ہیں

روزنامہ دعوت دہلی مورخہ ۲۴ ر جولائی
۱۹۶۹ء

اخبار الجمعیۃ دہلی کے شمارے کے فتتاحیہ مورخہ ۲۲ ر اپریل ۱۹۵۲ء

میں لکھا تھا ،

،، اس حقیقت سے انکار کرنا دنیا کی سب
سے بڑی سچائی کا انکار ہوگا کہ ہندوستان
اسلامی اور دینی مدارس خصوصاً دار العلوم
دیوبند نے اسلام اور مسلمانوں کی جو جلیل
القدر خدمات انجام دی ہیں اور جس
اس نے ذہنوں کو اسلامی سانچوں میں
ڈھالا ہے اسکی نظیر دنیا کے کسی نظام تعلیم
میں نہیں مل سکتی ، اتنی سستی اور ارزاں تعلیم
جو عربی مدارس میں اب تک دی گئی ہے
وہ ساری دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے ، مدرسین
کو اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ شاید آجکل دفتر کے
چپڑاسیوں کو ملتی ہوگی ، وہ بوریوں پر بیٹھ
کر درس دیتے ہیں تاکہ ایسے طلباء تیار ہوں
جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے ذمہ دار
بنیں ، طلباء کی استقامت کا یہ حال ہے
کہ انہیں جو کچھ مل گیا اس پر قناعت کر لی
مدرسہ سے اگر امداد بھی ملی تو اتنی کہ صرف
تیل اور صابن خریدا جا سکے ، اور طلباء اپنے
ہاتھوں سے کپڑے صاف کر سکیں ، یہ طلبائے
یہ طلباء محض اللہ کی رضا کے لئے اپنے
آپ کو وقف کر دیتے ہیں اور کوئی پرواہ
نہیں کرتے اگرچہ انہیں کسی وقت فاقہ سے
رہنا پڑے اور ان کے بدن پر سالم کپڑا بھی
نہ ہو ، ان مدارس نے جس قدر سستی تعلیم
دی ہے اگر اس کے اعداد و شمار شائع
ہوں تو شاید دنیا کو اس پر یقین نہ آئے
یہ مدارس اسلامی زندگی کا سرچشمہ ہیں
جن کے ذریعے سے مسلمانوں کے مذہبی
جسم میں دین وعقائد کا گرم خون داخل
کیا جاتا ہے اور اس حقیقت سے تو سب
ہی واقف ہیں کہ دار العلوم دیوبند نہ صرف
ہندوستان کا بلکہ ایشیا کا سب سے
بڑا دینی مرکز ہے جس میں دنیا بھر کے
طلباء تعلیم پاتے ہیں اور جس کے فیضان
علمی کی چادریں تمام ایشیا پر پھیلی ہوئی
ہیں ، الجمعیۃ دہلی ۲۲ ر اپریل ۱۹۵۲ء

پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ ،، تعمیر حیات لکھنؤ ،، کے ایڈیٹر
مولانا شمس الحق صاحب ندوی

،، دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوۃ العلماء
ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ،،
کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں

،، دار العلوم دیوبند کا قیام ملک کے ان
نامور اور باخدا علماء نے کیا تھا جن کو
ملت کی دشواریوں کا بڑا احساس تھا اور
اس ملک میں اسلامی حکومت کے خاتمہ اور
بیرونی طاقت کی عملداری کے اثر سے مسلمانوں
کو مذہب وسیاست کے میدانوں میں جو دھکا
پہنچا تھا اس کا ان کو صحیح شعور تھا اس
وقت کے دشوار حالات میں مسلمانوں کے
مختلف اصحاب فکر واخلاص نے اپنی اپنی
صلاحیت کے مطابق میدان عمل اختیار کئے
اور ان سے جو ممکن ہو سکی جد وجہد کی ،
اس وقت کے میدانوں میں بیرونی طاقت
کا مقابلہ سیاسی میدان میں اور مسلمانوں کو
باعزت مقام پر رکھنے کیلئے تعلیمی میدان
میں ضروری بندوبست وانتظام تھا ، دینی
تعلیم جو مسلمانوں کے مذہبی بقاء کا اصل
ذریعہ تھی دار العلوم کی جد وجہد کا میدان
بنی اور اس نے اس سلسلہ میں بہت جلد
برصغیر اور اس کے اطراف میں دینی
تعلیم کے سب سے بڑے ادارہ کی حیثیت
اختیار کر لی اور ملت اسلامی کو علماء کی پے
درپے جماعت مہیا کی ، سو سال سے زیادہ
طویل تاریخ میں وہاں سے استفادہ کر کے
اطراف وبیرون ملک میں ہزاروں ہزار علماء

پھیلے، ان میں خوش بیان، واعظ، عالم، مفتی خطیب اور اہل قلم ہر طرح کے لوگ تھے، انہوں نے مختلف مقامات پر مکاتب اور مدارس قائم کئے اور اپنے مادر علمی سے حاصل ہونے والے فیض کے چھوٹے بڑے دیگر مراکز بھی ملک میں پھیلا دیئے

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بڑی عظیم تاریخ ہے برصغیر اور اس کے اطراف کو اس سے بڑا فیض پہنچا، حدیث و فقہ کے علوم کی بطور خاص بڑی خدمت ہوئی، اور یہ خدمت صرف خدمت ہی نہیں بلکہ اس عہد اخیر کے پر آشوب حالات میں ان کی بڑی حفاظت ہوئی، اگرچہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند اس میدان میں تنہا نہ تھا بلکہ متعدد مراکز علوم دینیہ اس کے قیام سے قبل اس برصغیر میں کام کر رہے تھے، اور انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی معاصرت کی، لیکن ان کے درمیان دارالعلوم دیوبند کو امتیاز رہا، اس امتیاز کے تین پہلو ہیں، ایک تو یہ کہ وہ ان سب سے زیادہ شہرت کا مالک رہا، دوسرے یہ کہ اس کو زیادہ وسعت مرکزیت حاصل رہی، تیسرے یہ کہ مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں بھی اس نے قیادت فراہم کی، دارالعلوم دیوبند کے وابستگان نے غیر ملکی طاقت کو ملک سے نکالنے کی جدوجہد میں پوری شرکت کی اور اس کا اپنے دائرے میں خاصا اثر پڑا،

دارالعلوم دیوبند جن حالات میں قائم ہوا تھا اور اس نے جس طرح کے فضلاء اور قائدین تیار کئے اور جدوجہد کی ایک طویل تاریخ بنائی وہ سب ناقابل انکار حقیقت ہے، دارالعلوم دیوبند برصغیر میں بسی ہوئی مسلم امت کا قیمتی سرمایہ اور علوم دینیہ کا ایک بڑا قلعہ ہے، اس کے شجر علمی کی آبیاری مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے مایہ ناز علماء و اہل دین نے کی

پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ فروری ۱۹۸۰ء

پندرہ روزہ خیر وخبر علیگڈھ

پندرہ روزہ خیر وخبر کے "دارالعلوم دیوبند نمبر" کے شمارے میں ڈاکٹر ظہور الحق صاحب لکھتے ہیں"

"یہاں کے اساتذہ میں توکل اور استغنا کی جو کیفیت دیکھی اس ادارے سے ان کی وابستگی اور دینی و اخلاقی اقدار کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے اداروں میں اساتذہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ آمدنی کے ذرائع کسی طرح تلاش کریں، مگر یہاں کے اساتذہ اپنی قلیل تنخواہوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ادارے کی خدمت کو عین سعادت سمجھتے ہیں، کبھی کبھی تو بڑی تنخواہوں کی پیشکش کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور اپنے عزیز ادارے سے وابستگی کو باعث فخر خیال کرتے ہیں، میں نے علی گڑھ کے بعض بااثر ذمہ داروں کے ایماء سے وہاں سے ایک استاد صاحب کو لکھا کہ ان کی قابلیت واہلیت و تجربہ کے مطابق ایک اچھی اسامی خالی ہے تقرر کی قوی امید ہے، درخواست بھیج دیجئے، میرے اس خط کے جواب میں ان صاحب نے درخواست کا مقررہ فارم واپس بھیج دیا اور لکھا، الحمد للہ میں یہاں بہت مطمئن ہوں، اکابر کی خدمت کے مواقع میسر ہیں، دارالعلوم کی ملازمت میرے لئے صرف ذریعہ معاش نہیں ہے بلکہ ایک سعادت ہے میرے اکابر و اساتذہ اگر مجھے وہاں کی خدمت کے لئے حکماً بھیجدیں تو مجھے انکار کی مجال نہیں ورنہ میں دیوبند کو رہتی زندگی تک چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں آپکی توجہ اور مہربانی کا شکر گذار ہوں اللہ آپ کو اس کا اجر دے"

استغناء کی ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی جن کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد قوم میں سے ایسے افراد تیار کرنا تھا اور ہے جو ایک طرف دینی علوم کے ماہر، اسلامی روح و جذبے سے سرشار شخصیت کے مالک اور اسلامی شعار کے جیتے جاگتے نمونے ہوں تو دوسری طرف قوم وملت کے بے لوث خادم اور بہی خواہ اور اس کے محافظ ہوں"

دارالعلوم کی تاریخ ایسی ممتاز شخصیتوں سے مزین ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے وقف کر دیں، اور جو اپنے علم و عمل، بلندیٔ اخلاق و کردار اور مثالی کمالات و فضائل کی وجہ سے زندہ و جاوید رہینگی

(پندرہ روزہ خیر وخبر علی گڈھ)

(۱۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء)

نماز کا حکم ● — اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور خود بھی اس پر قائم رہ ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے، ہم تجھے روزی دیتے ہیں اور پرہیزگاری کا انجام اچھا ہے" (طٰہٰ آیت)

وقف لازم کی نحوی و معنوی تشریح

مولانا قاری محمد تقی الاسلام مقیم ریاض ـــــ سعودی عرب

سورۃ الذاریات"

اس میں وقف لازم ایک جگہ ہے"

نمبر ا۔ ابراھیم المکرمین ۲۴ ع ۲"

یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ اذ دخلوا، جو اسکے بعد ہے اسکا اذ، ھل اتاک، کے لئے ظرف ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ "کیا آپ کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے عزت دار مہمانوں اور فرشتوں کا قصہ اس وقت پہنچا ہے جب وہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے، حالانکہ اس قصہ کا اس وقت آپ کے پاس نہ پہنچنا بالکل ظاہر ہے کیونکہ یہ واقعہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے کئی ہزار سال پہلے کا ہے،

اور المکرمین پر وقف کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اذ دخلوا والا، اذ، وقع مقدر کے متعلق ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ،، کیا آپ کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عزت دار مہمانوں کا قصہ پہونچا ہے اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب وہ یہاں فرشتے جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھے"

[سور]ۃ الطور اس میں وقف لازم [ایک ج]گہ ہے

فی خوض یلعبون ۱۲ م ع ۱"

وصل کرتے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ یوم یدعون جو اسکے بعد ہے وہ یلعبون کا ظرف ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ یہ جھٹلانیوالے کفار اس دن غفلت او کھیل میں مشغول ہونگے، جس دن انکو دوزخ کی آگ کی طرف دھکے دیئے جائیں گے، حالانکہ اس وقت تو بڑے سے بڑے غافلوں کی غفلتیں ختم ہوجائینگی" اور یلعبون پر وقف کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یوم یدعون جملہ مستانفہ ہے اور اس میں جو یوم ہے وہ واذکروا مقدر کا ظرف ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ یہاں غفلت و کھیل میں مشغول ہیں اور قطعاً توجہ نہیں کرتے لیکن انہیں وہ دن بھی یاد رکھنا چاہیئے جس دن ان کو دوزخ کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا اور کہا جائیگا یہ ہے وہ آگ جسے تم جھوٹا بتایا کرتے تھے"۔

سورۃ القمر اس میں وقف لازم دو جگہ ہے،

(۱) فتول عنھم ۶ م ع ۱، یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ یوم یدع الداع جو اسکے بعد ہے اس میں یوم کا لفظ فتول کا ظرف ہے، اور معنی یہ ہوجاتے ہیں" اور آپ ان سے اس دن منہ موڑلیں جس دن پکارنے والا ایک اجنبی چیز یعنی بڑے عذاب کی طرف پکارے گا اور اس میں گرفتار کرنے کے لئے ان کو بلائے گا، حالانکہ اصل معنی یہ ہے کہ آپ ان سے دنیا ہی میں موڑلیں اور بے رخی اختیار کرلیں اور عنھم پر وقف کرنے سے یوم یدع الداع والے جملہ کا مستانفہ ہونا اور یوم کا اذکرو مقدر کے لئے ظرف ہونا واضح ہوجاتا ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ آپ ان سے بے رخی اختیار کیجئے اور اس دن کو یاد کیجئے اور ان کو یاد دلایئے جس دن ایک پکارنے والا انہیں سخت عذاب کی طرف دعوت دے گا

(۲) فی ضلل و سعر ۴۷ م ع ۳، یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ یوم یسحبون جو اس کے بعد ہے اسمیں جو یوم ہے وہ ان کی خبر کے متعلق کا ظرف ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ بلاشک یہ سیہ کار اس دن گمراہی اور بے ہوشی میں میں ہونگے جس دن انہیں منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائیگا، حالانکہ اس دن سب کی بیہوشی اور گمراہی ختم ہو جائیگی"

اور سعر پر وقف کرنے سے جملہ یوم یسحبون کا مستانفہ ہونا اور یوم کا اذکر مقدر کا ظرف ہونا واضح ہوجاتا ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ بے شک یہ گنہگار لوگ دنیا میں تو گمراہی اور بیہوشی میں ہیں لیکن ان کو

وہ دن یاد رکھنا چاہیے کہ جس دن ان کو منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائیگا،،

سورۃ الرحمٰن:

اس میں وقف لازم صرف ایک جگہ ہے،،

(۱) یکذب بہا المجرمون م ۞ یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ جملہ یطوفون جو اسکے بعد ہے وہ المجرمون سے حال ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ یہ وہ دوزخ ہے جسکو گنہگار لوگ اس حالت میں جھوٹا بتلایا کرتے تھے کہ یہ اس آگ کے اور تیز کھولتے ہوئے پانی کے درمیان گشت لگا رہے ہیں حالانکہ اس دوزخ میں چکر لگانے کی حالت آخرت میں پیش آئیگی، اور المجرمون پر وقف کرنے سے جملہ یطوفون کا مستانفہ ہونا واضح ہوجاتا ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ یہ وہ دوزخ ہے جسے گنہگار لوگ جھوٹا بتایا کرتے تھے اور وہاں ان کا حال یہ ہوگا کہ اس دوزخ کے اور خوب کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر لگا رہے ہونگے اللھم اجرنا من النار،،

سورۃ الواقعۃ:

اس میں وقف لازم ایک جگہ ہے،،

(۱) لوقعتہا کاذبۃ ۲ م ۞ یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ خافضۃ رافعۃ جو اسکے بعد ہے یہ دونوں کاذبۃ کی صفتیں ہیں اور اس صورت میں معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ اس قیامت کے قائم ہونے میں ایسا جھوٹ نہیں ہوگا جو نیچا اور اونچا کرنے والا ہو، حالانکہ حقیقت کی رو سے خافضۃ رافعۃ ھی مقدر کی خبر ہے اور یہ جملہ مستانفہ ہے اور کاذبۃ پر وقف کرنے سے جملہ کا مستانفہ ہونا پوری طرح واضح ہوجاتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں کہ قیامت کے قائم ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے بلکہ وہ ایک واقعی حقیقت ہے جو پیش آکر رہیگی پھر فرماتے ہیں کہ خافضۃ رافعۃ، وہ قیامت گنہگاروں نافرمانوں کو پست اور نیچا کر دینے والی ہے اور فرمانبرداروں کو اونچا کرنے والی ہوگی،، اللہ ہمارے حق میں بھی قیامت کو رافعۃ ہی بنائے، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم،،

سورۃ الحشر:

اس میں وقف لازم ایک جگہ ہے،

(۱) شدید العقاب م ۞ یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ للفقراء المہاجرین جو اسکے بعد ہے اسکا لام جارہ شدید کے متعلق ہے اور اس صورت میں معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ بلاشک اللہ تعالی ہجرت کرنے والے محتاجوں کو سخت سزا دیگا اور یہ معنی واقع اور حقیقت کے بالکل خلاف ہیں کیونکہ مہاجرین فقراء تو عظیم الشان ثواب حاصل کرینگے،، اور شدید العقاب پر وقف کرنے سے جملہ للفقراء المہاجرین کا مستانفہ ہونا اور اس کے اول میں مبتدا کا مقدر ہونا واضح ہوجاتا ہے اور یہاں عبارت کی اصل مال الفئ للفقراء المہاجرین ہے، اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ حق تعالی شانہ گنہگاروں کو سخت سزا دینگے اور فئ اور غنیمت سے حاصل ہونے والا مال فقراء مہاجرین کا حق ہے،،

سورۃ المنافقون:

اس میں وقف لازم ایک جگہ ہے

(۱) انک لرسول اللہ م ۞ یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے کہ یعلم واللہ یعلم جو اس کے بعد ہے وہ انک لرسول اللہ پر معطوف ہوکر منافقین کے مقولہ میں شامل ہے اور یہ بھی ان کی کہی ہوئی بات ہے اور معنی یہ ہوجاتے ہیں کہ جب یہ منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں اور پکا اقرار کرتے ہیں کہ بلاشک آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ پاک بھی جانتے ہیں کہ بلاشک آپ ان کے رسول ہیں اور یہ معنی واقع کے بالکل خلاف ہیں کیونکہ اس کے قائل ہوتے سے تو منافقین بھی سچے مومن بن جاتے ہیں اور لرسول اللہ پر وقف کرنے سے جملہ واللہ یعلم کا مستانفہ ہونا واضح ہوجاتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ منافقین یہ شہادت دیتے ہیں کہ بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں اسکے بعد حق تعالی شانہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ منافقین اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں،،

سورۃ التحریم

اس میں وقف لازم ایک جگہ ہے،

(۱) امنوا امرأت فرعون م یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہوجاتا ہے

کہ اذ قالت جو اس کے بعد ہے اس کا
اذ، وضرب اللّٰہ کا ظرف زمان ہے
اور معنی یہ ہیں کہ اللّٰہ پاک نے ایمان والوں
کو سمجھانے کے لئے ایک باتر مضمون اس
وقت بیان کیا جب فرعون کی بیوی جناب
آسیہ رضی اللّٰہ عنہا نے اپنے رب کے دربار
میں دعا کی تھی اور یہ معنی اس لئے فاسد
ہیں کہ ان کی دعا کرنے کا وقت نبی کریم صلی اللّٰہ
علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھا،
اور امرأت فرعون پر وقف کرنے سے
جملہ اذ قالت کا مستانفہ ہونا اور اذ کا وقت
مقدر کے لئے ظرف ہونا واضح ہو جاتا ہے
اور معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ اور اللّٰہ پاک نے ایمان
والوں کو سمجھانے کے لئے ایک مضمون یعنی
فرعون کی بیوی کا قصہ بیان کیا اور یہ قصہ اس
وقت پیش آیا تھا جب انہوں نے اپنے
پروردگار سے دعا کی تھی،،

سورۃ الملک

اس میں وقف لازم ایک جگہ ہے،، (۱) صٰفّٰتٍ ویقبضن م (آیت ۱۹)
یہاں وصل کرنے سے یہ وہم ہو جاتا ہے
کہ جملہ ما یمسکھن جو اس کے بعد ہے
وہ یقبضن کی مرفوع ضمیر سے حال ہے اور
معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ کیا ان مشرکین نے
اپنے اوپر یعنی آسمان و زمین کے درمیانی
خلا میں پرندوں کو نہیں دیکھا جن کی حالت
یہ ہے کہ وہ اڑتے ہوئے اپنے پر کھول لیتے
ہیں اور ان کو اس حالت میں سمیٹ بھی لیتے
ہیں کہ ان کو حضرت رحمان ہی گرنے سے روکتے
اور بچاتے ہیں اس صورت میں روکنے اور
بچانے کی نعمت کا ذکر ایک مستقل نعمت کی
حیثیت سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا ذکر پہلی
نعمت کے تابع ہونے کی صورت میں آتا ہے
اور ویقبضن پر وقف کرنے سے جملہ
ما یمسکھن کا مستانفہ ہونا واضح ہو جاتا
ہے اور اس کا ذکر بھی ایک مستقل نعمت کی
حیثیت سے آجاتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ
اور کیا ان مشرکین نے پرندوں کو نہیں دیکھا
جو اڑتے ہوئے پروں کو پھیلا بھی لیتے ہیں
اور سمیٹ بھی لیتے ہیں، نیز ان کو اس پھیلانے
اور سمیٹنے کی حالت میں حضرت رحمان ہی گرنے سے
روکتے اور بچاتے ہیں پس گرنے سے روکنا
اور بچانا بھی ایک مستقل نعمت ہے،،

بقیہ : تحریک ...

ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کے لئے گھروں
سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے
شاملی کی طرف مارچ شروع کر دیا جس کا
نصب العین دہلی تھا، سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۲۹
ابتداء میں دوسرے معرکوں کی طرح اس معرکہ
میں بھی اللہ تعالیٰ نے کامیابیاں عطا کیں
حتی کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا انگریزوں
سے توپ چھیننا ایک تاریخی صداقت ہے،
(دیکھیں انوار قاسمی، سوانح قاسمی، علماء ہند کا
شاندار ماضی نیز دوسرے معاصر تذکرے)
لیکن مقدرات الٰہیہ کے پیش نظر دوسرے حصوں
میں غداران ملک و قوم کی پیہم سازشوں کے
سبب تحریک وقتی ناکامی کا شکار ہوئی تو
یہاں بھی اثر پڑا اور مسلمان قوم اور تمام ہندی
اقوام کو اپنی آزادی کے لئے ابھی مزید انتظار
کرنا پڑا۔ اس جہاد کی ناکامی کے بعد علمی محاذ
کھولا گیا جس کی پہلی کڑی دار العلوم دیوبند تھا
اس علمی محاذ نے کس طرح تحریک کو پروان چڑھایا
یہ الگ داستان ہے جو وقت چاہتی ہے،
ــــ یار زندہ صحبت باقی،،

قرآن پاک کے انگریزی اور لاطینی تراجم

مولانا عبد الماجد دریاآبادیؒ

یورپ کا نام آتے ہی آج تصور دماغ کے سامنے اعلیٰ تعلیم یافتہ آبادی اور اس کے سارے لوازم آجاتے ہیں، عالیشان کالج اور یونیورسٹیاں، عظیم الشان کتب خانے اور تجربہ گاہیں، فلسفہ اور سائنس کے ماہرین، تاریخ و ادب کے پروفیسر وغیرہا، ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل کا یورپ اس سے بالکل مختلف تھا اس کے شہر ایسے تھے جیسے ہمارے دیہات کوئی پڑھا نہ لکھا، اور خیر برطانیہ وغیرہ کس شمار میں تھے، خود روما اپنی پچھلی عظمت اور اقتدار کے باوجود بس کچھ یونہی سا تھا، پڑھنے لکھنے کا شوق خصوصاً مسلمانوں سے متعلق معلومات کہنا چاہئے کہ بارہویں صدی مسیح سے شروع ہوا بلکہ محاربات صلیبی نے مسلمانوں اور مسیحیوں کو صف بہ صف میدان میں لا کھڑا کیا اب رفتہ رفتہ فرنگیوں کو مسلمانوں کے علوم، ان کی تہذیب و تمدن، ان کے مذہب سے صحیح واقفیت کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ قرآن مجید کا پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں موجودہ معلومات کے مطابق سب سے پہلے ۱۱۴۳ء میں ہوا، اور مطبع کی ایجاد کے بعد سنہ ۱۵۴۳ء میں بمقام باسل چھپ کر شائع ہوا اس کے بعد دوسرا ترجمہ کہا جاتا ہے کہ پہلے سے بدرجہا بہتر ہے سنہ ۱۶۹۸ء میں بمقام پیڈوا شائع ہوا، مترجم کا نام ایل مرویسی ہے اور منقول ہے کہ یہ شخص اپنے وقت کے معیار سے خاصا فاضل تھا،

انگریزی ترجمہ

اس کے بعد اطالوی اور فرنچ زبانوں میں ترجمے ہونے لگے، انگریزی میں سب سے پہلا ترجمہ جو دراصل لیٹن مترجم کا ترجمہ ہے سنہ ۱۶۴۸ء سے سنہ ۱۶۸۸ء تک شائع ہوتا رہا یہ اب گویا ناپید ہے دوسرا ترجمہ جارج سیل کے قلم سے لندن میں سنہ ۱۷۳۴ء میں شائع ہوا اور اس کی مقبولیت کی دلیل یہی کافی ہے کہ اس وقت سے اب تک برابر اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے ہیں، سوا دو سو سال تک اور پھر متعدد دوسرے اور تازہ ترجمے ہونے کے بعد بھی اتنی ہر دلعزیزی قائم رہ جانا عجائبات میں ہے لیکن سیل کا ترجمہ اس کا غیر مستحق ہے بھی نہیں، اول تو اس مترجم کو کلام مجید کے ساتھ اچھی خاصی ہمدردی ہے اس کی عظمت کا وہ دل سے قائل ہے (عجب نہیں کہ درپردہ مسلمان بھی ہو گیا ہو) اور پھر اس نے ترجمہ کرتے وقت بیضاوی وغیرہ مفسرین کو بھی پیش نظر رکھا ہے، تفسیری اور توضیحی حاشیے اس نے کثرت سے دیئے ہیں کتب تفسیر و سیر کے حوالے بھی ملتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علاوہ دیباچے کے ایک بڑا مفصل مقدمہ بھی اس نے سپرد قلم کیا ہے، جس کی آٹھ فصلوں میں اس نے تاریخ عرب جاہلیت، تاریخ مسیحیت، خصوصیات قرآن، اوامر ونواہی قرآن، قرآن کے ضوابط دیوانی، جمعہ اور اشہر حرم اور فرق اسلامیہ پر اس میں تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ ضخامت ۲۰۰ صفحے کے قریب پہنچ گئی ہے

مدت دراز تک یہی ایک ترجمہ انگریزی میں متداول اول رہا، یہاں تک کہ سنہ ۱۸۶۱ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک استاد جے ایم راڈ ویل نے اپنا ترجمہ شائع کیا اور زبان میں بہت کچھ اصلاحیں کیں، اتنی لمبی مدت میں انگریزی زبان میں تغیرات ہو جانے لازمی تھے، جیسے اردو میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کی زبان، شیخ الہند محمود الحسنؒ کے وقت خاصی پرانی ہو چکی تھی، جو انگریز اپنی زبان و ادب سے زیادہ ذوق رکھتے تھے ان میں راڈویل کا ترجمہ زیادہ مقبول ہوا نظر ثانی اور ترمیم کے بعد دوسرا ایڈیشن بار بار طبع ہوتا رہا، اس میں حاشیے نسبتاً کم ہیں البتہ راڈویل نے جدت کی کہ سورتوں کی ترتیب تاریخ نزول کے مطابق کر دی،

چنانچہ شروع سورۃ علق سے لے کر مدثر مزمل
ہوتے ہوئے ختم سورۃ مائدہ پر کیا ہے"
۱۸۸۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک
جرمن پروفیسر جو خود بھی سنسکرت کا عالم تھا
مشرق کی تمام کتب مقدسہ کو انگریزی میں
منتقل کرنے کا خیال پیدا ہوا، قرآن مجید
کا ترجمہ اس نے پروفیسر پامر کے سپرد کیا
جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی زبان کے استاد
تھے، پامر کا ترجمہ قرآن دو ضخیم جلدوں میں
۱۹۰۰ء میں نکلا، اور ایک زمانے تک مستند
اور عالمانہ سمجھا جاتا رہا، اور اتنا تو واقعہ ہے
کہ اس کا ترجمہ بمقابل راڈویل وغیرہ کے الفاظ
قرآنی سے قریب تر ہے، اس کی علمی شہرت کچھ
روز بعد سرد ہو گئی، البتہ اس کے ترجمے کے مختلف
ایڈیشن چھوٹے سائز کی ایک جلد میں نکلا
اس پر مقدمہ پروفیسر نکلسن کے قلم سے ہے
تفسیری حاشیئے پامر کے ترجمے میں بہت کم ہیں

جزوی ترجمے

یہ سارا تذکرہ مکمل قرآن کے ترجموں کا تھا، لیکن
اسی کے ساتھ ساتھ جزوی ترجموں کا سلسلہ بھی
جاری رہا، ای ڈبلیو لین اپنے زمانے میں
ایک نامور مستشرق انگریز تھا، اس نے
نہ صرف الف لیلیٰ کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا
بلکہ قاموس کی ضخیم اور مشہور شرح تاج العروس
کو بھی انگریزی کی آٹھ طویل و عریض جلدوں
میں لے آیا تھا، اس نے ۱۸۴۳ء میں
منتخبات قرآن انگریزی شائع کئے، کتاب کے
دو حصے تھے، پہلے میں اسلامی عقائد سے متعلق
قرآنی آیات کے ترجمے تھے، توحید، رسالت
قرآن، وحی، حشر، ملائکہ، جنت، تقدیر، جہنم
، کفر وغیرہ عنوان وغیرہ کے زیر عنوان اور دوسرے
حصے میں قصص قرآن انبیاء سابقین،
کتب سماوی، آدم و حوا، قابیل و ہابیل
نوح و طوفان، عاد و ثمود، موسیٰ و عیسیٰ،
عزیر و مسیح وغیرہ سے متعلق اقتباسات تھے
یہ ایڈیشن اب نایاب ہے"
۱۸۷۹ء میں لین کے بھتیجے اور جانشین
اسٹینلی لین پول نے بہت کچھ ترمیم و اضافے
کے بعد اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا، گو اس
میں توضیحی حاشیئے بہت گھٹا دیئے، لیکن
ایک مفصل مقدمہ بھی اپنی طرف سے بڑھا دیا
لین، اور لین پول کا شمار اسلام اور مسلمین
کے ہمدردوں میں ہے اور یہ ہمدردی دونوں
تحریروں میں نمایاں ہے"

کچھ انتخابات

قرآن مجید کے کچھ اور انتخابات بھی اس سلسلے
کے شائع ہوئے، مثلاً ایک پادری سیل کے قلم سے
اور ایک سر ولیم میور (مصنف لائف آف محمد)
کی طرف سے لیکن کچھ زیادہ شہرت انہیں
حاصل نہیں ہوئی، ۱۸۹۴ء میں شامی
الاصل یہودی النسل انگریز ڈی، ایس،
مارگولیس نے (جو آگے جا کر آکسفورڈ میں
عربی کا پروفیسر ہوا اور اپنی اسلام دشمنی
میں نامور) بیضاوی کی تفسیر سورۃ آل عمران
کا ترجمہ شائع کیا، آل عمران کا انتخاب
شاید اسی لئے کیا کہ اس میں حضرت مریم
اور حضرت عیسیٰ کا ذکر تفصیل کے ساتھ
ہے، ۱۸۹۴ء میں وقت کے ایک اور مشہور
پادری اور مسلمانوں سے مناظرہ کرتے رہنے
والے ایم وہیری نے سیل کے قدیم ترجمے
و حواشی کو اصل قرار دیکر ایک مستقل
تفسیر چار جلدوں میں شائع کر دی، اس
تفسیر میں، بیضاوی، کشاف، جلالین
و تاریخ ابو الفداء وغیرہ کے حوالے تو سیل ہی کے
دیئے ہوئے موجود تھے، وہیری نے جن جدید
ماخذوں کے حوالے دیئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں
(۱) تفسیر روفی (معلوم نہیں کہ اس نام سے
کونسی تفسیر مراد ہے)
(۲) تفسیر حسینی (ملا حسین واعظ کاشفی کی
ایک چلی ہوئی تفسیر)
(۳) تفسیر فتح الرحمٰن (غالباً شاہ ولی اللہ
کے فارسی حواشی مراد ہیں)
(۴) حواشی شاہ عبد القادر دہلوی (غالباً موضح
القرآن مراد ہے)

مسلمان کا ترجمہ

۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں ایک انگریزی ترجمہ
دو ضخیم جلدوں میں مرزا ابو الفضل الہ آبادی
کا کیا ہوا شائع ہوا، یہ پہلا انگریزی ترجمہ
ہے جو متن قرآنی کے ساتھ چھپا، اوپر متن
قرآنی ہے اور صفحہ کے تحتانی حصہ میں اس کا
ترجمہ، حاشیئے اس میں بہت کم ہیں اور جتنے
بھی ہیں وہ سب آخر میں نمبر ڈال کر یکجا کر دیئے
گئے ہیں میرے پاس اس کا جو نسخہ ہے اس
کا سرورق وغیرہ غائب ہے ممکن ہے کوئی
دیباچہ اس کے شروع میں ہو ان کا ترجمہ
مدت ہوئی گمنام ہو چکا ہے"
عین اسی زمانے میں مولانا شبلی کی تحریک پر
یا کم سے کم ان کی حوصلہ افزائی پر ایک مستند اور
فاضلانہ ترجمہ کی طرح نواب عمادی الملک سید
حسن بلگرامی نے حیدر آباد دکن میں ڈال دی
تھی، نواب صاحب گو شیعی خاندان سے
تھے لیکن اپنے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے

کسی فرقے سے تعلق رکھنے کی بجائے محض مسلم تھے
انگریزی کے ادیب تھے۔ اور عربی ادب پر بھی
ان کی نظر گہری تھی، مولانا شبلی کے مضامین
الندوہ میں ان کا ذکر بار بار ملتا ہے، نواب صاحب
کا اندازہ تھا کہ دو سال میں کام ختم کر لیں گے
مگر اسی اثناء میں مولانا حمید الدین فراہی
(صاحب تفسیر نظم قرآن) سے ان کی مراسلت
شروع ہوگئی اور پھر مولانا خود بھی حیدرآباد
منتقل ہوگئے، اب نواب صاحب نے اپنے کام
پر محنت ان کی شرکت اور مشورہ سے شروع
کی اور اپنا پہلے کا مسودہ گویا بیکار کر دیا

نواب صاحب نے اپنے مسودہ کی کاپیاں اہلِ علم کے پاس برائے مشورہ روانہ کیں

بہرحال کام سورۂ طٰہٰ پارہ سولہ تک کسی نہ کسی
طرح پہنچا تھا، کہ ضعف و کبر سنی کے باعث
نواب صاحب کام سے معذور ہوگئے اور یہ
خدمت قرآنی جو بہت قابل قدر ہوتی اس منزل
پر ترک کردہ گئی، اور شائع ایک پارہ بھی نہ ہو
نواب صاحب نے ازراہ احتیاط اپنے مسودہ
کی سو دو سو کاپیاں طبع کرا کے اور سامنے کا
کالم سادہ چھوڑ کر مختلف اہل علم کے پاس
مشورہ اور اصلاح کے لئے روانہ کر دی تھیں
غالباً ۱۹۳۰ء تھا یا اس سے بھی کچھ قبل جب
ایک نومسلم محمد مارماڈیوک پکھتال کا ترجمہ "قرآن
مجید کا مفہوم" کے عنوان سے پہلی بار نکلا، پکھتال
اچھی زبان کا ادیب اور اہل قلم تھا، شروع ہی
سے مسلمانوں کا ہمدرد تھا اسلامی تاریخ سے
متعلق بھی اس کے کئی افسانے اس وقت
تک نکل چکے تھے، اس کی زبان کی خوبی اور
شائستگی کا کیا کہنا، اصل قرآن کی جاذبیت
زبان و بیان ایک حد تک ترجمہ میں منتقل
ہو آئی ہے، البتہ اس میں حاشیے برائے
نام ہی ہیں، پہلا ایڈیشن بغیر متن کے نکلا تھا
اس کے بعد متعدد ایڈیشن نکلے بعض مع اور
بعض حامل متن، تعلیم یافتہ مسلمانوں نے سکھ
کا سانس لیا اور اس ترجمہ کو پڑھ کر کہا کہ اب
جاکر ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ اپنی کتاب
دوسروں کے ہاتھ میں دے سکیں"

۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے آئی سی ایس
آفیسر عبداللہ یوسف علی کو جو اپنی انگریزی
انشاء پردازی میں مشہور اور ممتاز تھے، ترجمہ
قرآن مجید کا خیال آیا اور ڈھائی سال کے
عرصے میں قسط وار ان کا پورا ترجمہ لاہور کے
انگریزی پبلشر شیخ محمد اشرف نے شائع کر دیا
تفسیری نوٹ اس میں کثرت سے ہیں اور
اچھے ہیں اور انگریزی میں مدح و تحسین کے قابل
لیکن بحیثیت ترجمہ یہ کتاب کچھ زیادہ ممتاز
نہیں، اصل عبارت سے بہت دور مترجم
ہٹتے چلے گئے ہیں اور صرف خلاصہ مطلب کو
اپنی خوبصورت زبان میں لینے کو کافی سمجھا ہے
سب سے بڑھ کر یہ کہ زبان بجائے نثر کے
نظم کی اختیار کی ہے"

ان سطور کے راقم آثم نے بھی بہت سے مخلصوں
اور بزرگوں کی رہنمائی سے اور ہمت افزائی
سے ۱۹۳۳ء اس کام کو ہاتھ لگایا،
شروع میں مشکلات کا اندازہ نہ ہوا
بلکہ خیال یہ غالب رہا کہ پکھتال محمد علی وغیرہ
کے ترجمے موجود ہیں اور اردو میں بھی کافی
ذخیرہ مہیا ہے ان کی مدد سے آسانی کام
چل جائیگا، تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ خیال
خام تھا اتنی سہولتوں کے باوجود بھی نفس ترجمہ
ہی دشوار ہے، چہ جائیکہ تفسیر و حواشی
بہرحال کئی کئی بار کی ترمیموں اور نظر ثانی
کے بعد کام ۱۹۳۹ء کے آخر میں ختم ہوا،
ایک ندوی مخلص کی وساطت سے تاج
کمپنی لاہور نے ۱۹۴۰ء میں اس کے
طبع و اشاعت کی پیشکش کی پورا مسودہ
اسی وقت روانہ کر دیا گیا ادھر سے وعدہ
ہوا کہ پوری کتاب ڈھائی سال میں شائع
ہو جائیگی، پہلا پارہ ۱۹۴۱ء میں نکلا اور
دوسرا اس کے پورے دو سال بعد ۱۹۴۳ء
میں اور اس کے بعد کام ایک لخت ٹھپ ہوگیا
یہاں تک کہ پوری کتاب ۱۹۵۷ء میں جاکر
شائع ہوئی، ترجمہ بڑی حد تک لفظی کیا گیا
ہے اور زبان پرانی ہی استعمال کی گئی ہے
جو انگریزی بائبل کی مدت سے چلی آرہی
ہے"

۱۹۳۷ء، ۱۹۳۹ء میں ایک نئے ترجمے کا
ظہور پادری رچرڈ بیل، ڈی، ڈی لکچرار عربی
ایڈنبرا یونیورسٹی کے قلم سے دو جلدوں میں
ہوا، ترجمہ حامل المتن تو خیر کیوں ہوتا
حواشی سے بڑی حد تک محروم ہے
البتہ ایک جدت اس میں بالکل انوکھی ہے
راڈویل تو یہیں تک رہا کہ اس نے سورتوں
کی ایک ترتیب تنزیلی و ترتیلی گھڑلی تھی
اس بزرگ نے اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ سورتوں
کے اندر آیتوں کی ترتیب مکی و مدنی اور غیر یقینی
زمانے کے لحاظ سے گھڑلی اور کتاب بے تکلف
اسی طور پر چھاپ دی جیسے اور تو اور
مطالعہ میں اچھی خاصی الجھن ہوتی ہے

طبی معلومات

ککڑی، کھیرا اور خربوزہ — تین مفید پھل

حکیم آزاد شیرازی - مدیر تذکرہ لاہور

ککڑی، کھیرا اور خربوزہ بلاشبہ گرمی کے موسم میں تین انتہائی پھل ہیں۔ بشرطیکہ ان کا استعمال صحیح طریق سے کیا جائے۔

ککڑی جسے عربی میں قثاد اور فارسی میں خیارزہ کہتے ہیں ایک بیل دار پودے کا مشہور پھل ہے جو ایک بالشت سے لے کر نصف گز بلکہ ایک گز تک طویل ہوتا ہے۔ نہایت دبلی اور بالشت بھر لمبی ککڑی لکھنؤ کے بازاروں میں لیلیٰ کی انگلی کے نام سے فروخت ہوتی ہے۔ ککڑی لیلیٰ کی انگلی ہو یا مجنوں کی پسلی درجہ دوم میں سرد تر مزاج کی حامل ہے۔ صفراز اور خون کو ساکن کرتی ہے۔ پیاس کی شدت میں تسکین بخشتی ہے۔ اس کے کھانے سے خوب کھل کر پیشاب آتا ہے۔ اسی خاصیت کے باعث گردے اور مثانے کی پتھری کو خارج کرتی ہے۔ گرمی کے درد سر میں پیس کر ضماد کرنے سے فائدہ پہنچتا ہے۔ ککڑی کو دوپہر کے کھانے میں نمک مرچ لگا کر کھانا چاہیے۔

کھیرا: کھیرے کو عربی میں قثاء اور فارسی میں خیار کہتے ہیں۔ یہ بھی سرد تر مزاج رکھتا ہے۔ خون اور صفراء کی گرمی کو دور کرتا ہے۔ پیاس بجھاتا ہے، بکثرت پیشاب لاتا ہے — خونی بخاروں میں پیشاب کی جلن، یرقان اور خفقان حار میں مفید ہے۔ گرمی کے درد سر میں کھیرے کا سونگھنا اور اس کے چھلکے کو پیشانی پر رکھنا درد کو ساکن کرتا ہے اور نیند لاتا ہے۔ کھیرا خاص طور پر بے خوابی اور گرمی کے درد سر میں مفید ہے۔ البتہ سرد مزاج لوگوں میں نفخ پیدا کرتا ہے جس کی اصلاح سکنجبین سے ہو سکتی ہے۔

کھیرے کے استعمال میں بے احتیاطی سے۔ کام لینے کے باعث بدہضمی کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کے کھانے کا وقت بھی دوپہر کے کھانے کے دوران ہے۔ اس کی قاشیں پودینہ اور انار دانہ کی چٹنی لگا کر کھانے کے دوران کھانا چاہئیں۔ کھانے کے دوران کھیرے کے استعمال پر پانی پینے سے نقصان کا اندیشہ ٹل جاتا ہے۔ شربت بزوری میں کھیرے کے مغز شامل کئے جاتے ہیں۔

خربوزہ: خربوزہ جسے عربی میں بطیخ اور فارسی میں خربزہ کہتے ہیں گرمی کے موسم کا بہترین غذائیت بخش پھل ہے۔ گرمی کے موسم میں جب تک بارشیں نہ ہو لیں اس وقت تک آم کے بجائے خربوزہ کھانا چاہیے۔ کیونکہ آم کھانے کا بہترین موسم گرما نہیں بلکہ برسات کا موسم ہے۔

میٹھے خربوزے کا مزاج بدرجہ اول گرم اور بدرجہ دوم تر ہوتا ہے اور خام اور پھیکے خربوزہ کا مزاج بدرجہ اول سرد اور بدرجہ دوم تر ہوتا ہے۔ اکثر لوگ صرف شیریں خربوزہ

کھانا پسند کرتے ہیں۔ اور پھیکے خربوزہ کو پھینک کر نہ صرف کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ اس کے فوائد سے بھی محروم رہ جاتے ہیں گرم مزاج لوگوں کے لیے شیریں کی نسبت پھیکا خربوزہ زیادہ مفید ہے۔

خربوزے کا گودا جسم انسانی کو غذائیت بخشتا ہے اور بدن میں تری پیدا کرتا ہے، اس کی خوشبو دل و دماغ کو فرحت پہنچاتی ہے۔ خربوزے کے متواتر استعمال سے جسم کی لاغری دور ہو جاتی ہے۔ نیز اس کے متواتر کھانے سے دانت صاف اور چمکیلے ہو جاتے ہیں دانتوں پر جما ہوا میل بھی دور ہو جاتا ہے۔ خربوزہ اعتدال سے کھایا جائے تو قبض کشا ہے۔ لیکن کثرتِ استعمال سے اسہال آنے لگتے ہیں۔

مدر بول ہونے کے باعث خربوزہ مرض استسقاء، یرقان، قرحہ مجاری بول، نیز سنگ گردہ و مثانہ میں نہایت مفید پھل ہے۔ عورتوں میں دودھ کی کمی بھی دور کرتا ہے۔ اس کا گودا جلد کے نشانات اور چھائیں کو دور کرنے کے لیے طلا کیا جاتا ہے۔ خربوزے کا چھلکا نہایت کار آمد شے ہے

گردے اور مثانے کی پتھری کو توڑتا ہے۔ سخت گوشت کو جلد گلا دیتا ہے۔ خربوزہ کھانے کا بہترین وقت دو غذاؤں کے درمیان کا وقت ہے۔ جب ایک غذا معدہ میں ہضم ہو کر آنتوں کی طرف جا چکی ہوتی ہے اس لیے اس کے کھانے کا بہتر وقت عصر یعنی دوپہر اور شام کے کھانے کے درمیان کا وقت ہے۔

خربوزہ کے چھلکے سے نمک بھی حاصل کیا جاتا ہے اور یہ نمک سنگِ گردہ و مثانہ میں بہت مفید ہے۔ نمک کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ چھلکوں کو خشک کر لیا جائے۔ خشک چھلکوں کو جلا کر ان کی راکھ کو پانی میں ڈال دیں۔ دو چار دن پانی میں پڑی رہے۔ اس کے بعد پانی نتار کر آگ پر رکھ دیں۔ حتیٰ کہ پانی خشک ہو کر نمک بن جائے گا۔ یہ نمک شیشی میں محفوظ رکھ لیں۔

خربوزے، کھیرے اور لکڑی کے علاوہ گرمی کے موسم میں لوکاٹ، بیر، فالسہ، آلوچہ سیب وغیرہ پھل بھی ہوتے ہیں۔ جو مفید اثرات کے حامل ہیں۔

بقیہ: قرآن کے تراجم

بے شمار تراجم

تازہ ترین ترجمۂ قرآن کیمبرج یونیورسٹی کے موجودہ شہرہ آفاق عربی پروفیسر اے جے آربری کے قلم سے ہے ۱۹۵۳ء میں ان کا منتخبات قرآن مع مقدمہ ایک سو اسی صفحہ کی ضخامت سے نکلا تھا، اور مکمل ترجمہ دو جلدوں میں ۱۹۵۵ء میں نکل آیا ہے متن عربی کے علاوہ تفسیری حواشی سے بھی مُعرّا

قرآن مجید کے جہانگیری اثر کا کیا کہنا، یہ تذکرہ صرف انگریزی کے تراجم کا تھا، جرمن، فرنچ، اسپینی، روسی، وغیرہ دوسری زبانوں کا ذکر نہیں، اور پھر انگریزی میں بھی صرف انہی کتابوں کا نام لیا گیا جو براہ راست قرآن پر ہیں اور باقی جو کتابیں قرآن سے متعلق لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں تو ایسی کتابوں کا شمار ہی نہیں ۱۹۵۶ء کو امریکہ سے ایک نیا ترجمہ پنگوین سیریز کے سلسلہ میں نکلا، مترجم این جے داؤد نامی کوئی شخص ہیں، جو بظاہر کوئی مشرقی نژاد عیسائی معلوم ہوتے ہیں، یہ ترجمہ بھی علاوہ متن عربی سے معرّا ہونے کے توضیحی حاشیے بھی برائے نام ہی رکھتا ہے اور سورتوں کی ترتیب میں بھی مترجم صاحب نے راڈویل اور بل کی راہ پر چل کر اپنی خود رائی قائم کی ہے دیباچہ میں مترجم نے قرآن مجید کو ادبی حیثیت سے بے نظیر تسلیم کیا ہے۔"

اسلامی دنیا میں ایک ترجمہ پاکستان میں خواجہ عبدالوحید صاحب اپنے انگریزی پندرہ روزہ "الاسلام کراچی" میں قسط وار چھاپ رہے ہیں، جس کی آخری قسط سورۃ الشعراء پ ۱۹ کے ختم تک نکلی تھی، اس کے بعد غالباً پرچہ ہی بند ہو گیا، اسی سال ایک مکمل ترجمہ قرآن شیخ محمد اشرف لاہور نے شائع کیا ہے ۔ ۶۷

نورِ بصیرت

ارشاداتِ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

۱- ایمان اصل (جڑ) اور اعمال اس کی شاخیں ہیں۔ ایمان میں شرک سے بچو، اور اعمال میں معصیت سے۔

۲- اللہ تعالیٰ کی اطاعت قلب سے ہوتی ہے، صرف قالب (بدن) سے نہیں۔

۳- عمل کے بغیر قول اور اخلاص کے بغیر عمل ناقابلِ قبول ہیں (اخلاص) یہ ہے کہ مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔

۴- اے عمل کرنے والے! اخلاص پیدا کر، ورنہ فضول مشقت ہے۔

۵- اخلاص کی علامت یہ ہے کہ تو خلقت کی تعریف یا مذمت کی طرف توجہ نہ کرے۔

۶- خالق کا مقرب وہی ہے، جو اس کی مخلوق پر شفقت کرے۔

۷- جو خلق کے ساتھ خُلق میں فراخ تر ہے، وہ خالق سے نزدیک تر ہے۔

۸- مخلوق کی محبّت ان کی خیر خواہی کرنا ہے۔

۹- خالق کے ساتھ ادب کا دعویٰ غلط ہے، جب تک تُو اس کی مخلوق کے ساتھ ادب نہ رکھے۔

۱۰- رضائے خالق کے خواہش مند مخلوق کی اذیّت پر صبر کر۔

۱۱- مصیبتوں کو چھُپا، قربِ حق نصیب ہوگا۔

۱۲- میانہ روی نصف روزی ہے، اور حسنِ اخلاق نصف دین۔

۱۳- خالی تمنّا (بغیر عمل کے) حماقت کا جنگل ہے، جس میں احمق مارا مارا پھرتا ہے۔

۱۴- حیات کے دروازے کو وہ جب تک کھلا ہے، غنیمت جانتے ہوتے نیکی کر لو۔ کیونکہ وہ جلدی بند کر دیا جائے گا۔

۱۵- جو شخص اپنا معلم نہیں وہ دوسروں کا معلّم کیسے ہو سکتا ہے۔

۱۶- امیروں کے ساتھ عزت و غلبہ سے مل، اور غریبوں کے ساتھ انکساری اور فروتنی سے۔

۱۷- مومن جُوں جُوں بوڑھا ہوتا ہے، اس کا ایمان جوان (قوی) ہوتا ہے۔

۱۸- اہلِ غفلت کے پاس بیٹھنا ہی تیری غفلت کی علامت ہے۔

۱۹- تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے بُرے ہم نشین ہیں۔